رجسٹرڈ نمبر لے ۴۶۶

قیمت فی کاپی ۸ر

"نگار"
بک ایجنسی
لکھنؤ

تصانیف نیاز فتحپوری

"نگار"
بک ایجنسی
لکھنؤ

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے و ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جسمیں حسن زبان قدرت بیان اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئیگا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئیگا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

مکتوبات نیاز حصہ اول

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں، اس اڈیشن میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کر دیا گیا ہے اور ۲۶ پونڈ کاغذ پر طباعت ہوا ہے۔

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

مکتوبات نیاز (حصہ دوم)

یہ حصہ پہلے حصہ سے زیادہ ضخیم ہے اور اس میں اکثر مکاتیب نقادی حیثیت رکھتے ہیں وہ حضرات جنھیں شعر و شاعری سے دلچسپی ہو انھیں ان مکاتیب میں بہت سے عجیب و غریب نکات شعری نظر آئیں گے رنگین تحریر اور اسلوب ادا کی دلکشی کا ذکر فضول ہے کیونکہ حضرت نیاز کی اس خصوصیت سے ہر شخص آگاہ ہے۔

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان و تخئیل اسکی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔

ترغیبات جنسی (یا)

شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات انکی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے

نیا اڈیشن

مجموعۂ استفسار و جواب

ان تینوں جلدوں میں ۲۲ء سے لیکر ... تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی ... نہیں ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی ... تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اور اسکی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلوپیڈیا کی ...

قیمت ... روپیہ علاوہ محصول

"زیب دیتا ہے اسے جسقدر اچھا کہئے"

مرزا غالب نے یہ مصرع بادشاہ کے ہاتھ میں
چکنی ڈلی دیکھ کر کہا تھا مگر دنیا آج کل اسے

نکٹائی مارکہ

مال استعمال کر کے پڑھتی ہے

ہر قسم کا زردہ - مشکی قوام - الائچی دانہ - تیل عطر - عرق کیوڑہ و گلاب - اور مختلف قسم کے پان مسالون کو مشرقی نفاست اور طبی احتیاط کے ساتھ طیار کرنے والا مشرقی ہندوستان کا قدیم ترین کارخانہ آپ کی فرمائشات کا منتظر ہے ——— فہرست طلب فرمائیے

نکٹائی برانڈ زردہ فیکٹری - ۱۴۱ ہوڑہ روڈ ہوڑہ

ٹیلی گرام "مشکی قوام" ہوڑہ ——— ٹیلی فون :- ہوڑہ ۲۵۵

شاخیں :-

(۱) ۵/۱ - کیننگ اسٹریٹ کلکتہ
(۲) ۲۱۰ - ہیرسین روڈ - کلکتہ
(۳) ۹/۸ - راجہ گڑھ اسٹرانڈ روڈ - بمبئی
(۴) ۶۱ - ارسکین روڈ - بمبئی
(۵) ۱۸/۴ - ڈنکن روڈ بمبئی
(۶) ۱ - دارو والا برج اسٹیشن روڈ - پونا
(۷) ۱۸۳۸ - کالو پور چکلا - احمد آباد
(۸) ۹۲ - مغل ٹولی - منفورڈ روڈ - ڈھاکہ

نفیس اکیڈیمی - حیدر آباد (دکن) کی نفیس ترین پیشکش

مقام جمال الدین افغانی: چودھویں صدی ہجری کے مجدد اعظم کے حالات، خیالات اور سیاسیات کا مرقع - اردو زبان میں افغانی پر یہ پہلی کتاب ہے - قیمت تین روپیہ

اسلام کے سیاسی تصورات: اسلام کی تعلیمات اور سیاسی تصورات کی تصریح مقتدر مفکرین کے قلم سے - قیمت دو روپیہ بارہ آنے -

داستان کربلا: تاریخ اسلام کی وہ دردناک کہانی جسکی یاد تیرہ سو سال بعد بھی مسلمانوں کو تڑپاتی ہے - واقعہ کربلا پر مشاہیر کے مقالات کا مجموعہ قیمت دو روپیہ چودہ آنے

سیر افغانستان: - از علامہ سید سلیمان ندوی شاہ کابل نادرشاہ کی دعوت پر علامہ اقبال - سر راس مسعود اور علامہ سید سلیمان ندوی افغانستان گئے تھے یہ اسی تاریخی سفر کا روزنامچہ ہے - قیمت دو روپیہ آٹھ آنے

کوہ نور کی سرگزشت: - دنیا کے مشہور ہیرے کی مستند کہانی جو اپنے ساتھ سیکڑوں خونچکاں داستانیں رکھتا ہے - قیمت ایک روپیہ چار آنہ

ذکر جمیل: ماہر القادری کے نعتیہ کلام کا مجموعہ - قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ

نازیت: از شاہد حسین رزاقی ایم - اے دنیا کی اس خوفناک تحریک کی کہانی جس نے کروڑوں انسانوں کو تباہ و برباد، لاکھوں بیوہ و یتیم بنا دیا - قیمت دو روپیہ بارہ آنہ

قائدین کے خطوط جناح کے نام: مترجمہ سعید صدیقی - قیمت دو روپیہ مجلد رنگین گردپوش

فلسفۂ عجم: - علامہ اقبال کے انگریزی مقالات کا ترجمہ - قیمت تین روپیہ دو آنہ مجلد

نثر ریاض خیر آبادی: - مرتبہ عقیل احمد جعفری ریاض صرف شاعری ہی کا شہسوار نہ تھا بلکہ وہ نثر نگاری کا بھی مرد میدان تھا - ریاض نے اپنے شباب کے بہترین ایام نثر نگاری میں صرف کئے اتنی رنگین، نفیس اور شیریں نثر کی بنیاد ڈالی جو بعد والوں کے لئے نمونہ ثابت ہوئی - قیمت دو روپیہ آٹھ آنے

فکر اقبال: - علامہ اقبال کے افکار بلند پر مشاہیر اہل قلم کے گرانقدر مقالات کا مجموعہ قیمت چار روپیہ مجلد

تصورات اقبال: - از شاغل فخری مرحوم - علامہ اقبال کے فلسفیانہ و حکیمانہ خیالات کی تشریح و توضیح - قیمت تین روپیہ چھ آنہ مجلد

حکمت اقبال: - تعلیم اقبال، پیام اقبال اور فلسفہ اقبال پر مشاہیر کے مقالات کا مجموعہ - قیمت چار روپیہ مجلد

افادات محمد علی: - از رئیس احمد جعفری ہندوستان کے آتش نواز لیڈر کے مضامین و تقاریر کا مجموعہ قیمت تین روپیہ بارہ آنہ مجلد

افسانے - ناول - ڈرامے

بھوکا ہے بنگال: - مرتبہ ابراہیم جلیس بنگال کی بھوک سارے ہندوستان کی بھوک ہے - بنگال کی موت سارے ہندوستان کی موت ہے - بنگال ٹیگور اور نذر الاسلام کا بنگال سحر و نغمہ کا وطن آج بھوک، وباؤں اور موت کا شکار ہو رہا ہے - اسکی المناک تصویریں اس مجموعے کے افسانوں اور نظموں میں دیکھئے - کیا آپ میں تاب نظارہ ہے؟ جوش، جگر، اختر شیرانی، سردار جعفری، وامق، ساحر، مخدوم، دیویندر ستیارتھی، سومناتھ ہر ایک کا دل بھوکے بنگال کے دل کے ساتھ ساتھ دھڑک رہا ہے - قیمت دو روپیہ بارہ آنے -

چالیس کروڑ بھکاری: - ابراہیم جلیس جلیس کی کہانیاں ہمارے دور کی سنگین ترین کہانیاں ہیں - ان بورژوا اقتدار کے خلاف لکھی ہوئی جوانوں کا احتجاج ہے اور باغی روحوں کا رقص وحشیانہ جو ایک سرکش مستقبل کے طلوع فردا کا مژدہ سناتی ہیں - قیمت دو روپیہ بارہ آنے -

زخمونا دیس: - ابراہیم جلیس جلیس کی ہر تحریر ایک زہریلا احتجاج ہے اس میں کہیں جنسی جذبات کے گھناؤنے خاکے اور کہیں بھوک و بیکاری کے بوجھ تلے دم توڑتی ہوئی انسانیت کے نوحے ہیں قیمت دو روپیہ بارہ آنہ

آج کل کے رومان: چودہ بلند پایہ خواتین کے بلند پایہ افسانوں کا مجموعہ قیمت دو روپیہ بارہ آنے

طوفان: - از رئیس احمد جعفری (ناول) یہ دل کے سمندر کا طوفان ہے جو ایک عورت کی زندگی میں اٹھا اور تنکے کی طرح بہا لے گیا - قیمت تین روپیہ چھ آنہ مجلد

سرنوشت: - ایک ایسا دلدوز افسانہ جس کی تخلیق میں آہوں اور دل پاروں سے کام لیا گیا ہے - قیمت دو روپیہ

کرنل لارنس: - کرنل لارنس کی پراسرار زندگی کے مستند حالات جس نے اپنی پوری زندگی ملت اسلامیہ کی تباہی میں صرف کی - قیمت دو روپیہ بارہ آنہ

مظلوم دوشیزہ: - (جون آف آرک) کا اردو ترجمہ - فرانس کی نجات دہندہ کسان لڑکی جسے اہل ملک نے زندہ جلا دیا - قیمت تین روپیہ

خطا: قیسی رامپوری (ناول) عورت کے تہ در تہ پردوں میں چھپے ہوئے دکھوں کی دردناک داستان - قیمت تین روپیہ

سزا: - قیسی رامپوری (ناول) قیمت دو روپیہ چار آنہ

ضربیں: - قیسی رامپوری (افسانے) قیمت تین روپیہ

غبار: - قیسی رامپوری (افسانے) قیمت دو روپیہ چار آنے

حادثے: - عروج (افسانے) قیمت دو روپیہ چار آنہ

محبوبہ: - عطیہ شوکت (ناول) قیمت دو روپیہ

ہچکیاں: - صدیقہ بیگم سیوہاروی (افسانے) قیمت تین روپیہ چار آنہ

دل کی آگ: - ظفر واسطی (ناول) قیمت ایک روپیہ بارہ آنے

پیٹ کی ماری: - مبارز الدین قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ

چودھری محمد اقبال سلیم گاہندری - پروپرائٹر

نفیس اکیڈیمی - عابد روڈ - حیدر آباد (دکن)

موجودہ ادب کے انتخاب

نظم

بانگ درا ... مجلد ... اقبال ... للعہ
بال جبریل ... " ... " ... للعہ
ضرب کلیم ... سے
زبور عجم ... " ... " ... للعہ
ارمغان حجاز ... " ... " ... للعہ
پس چہ باید معہ مسافر ... عـ
پیام شباب .. قاضی نذرالاسلام عہ
رنگ بست ... اثر لکھنوی ... عہ
شعلہ و شبنم ... جوش ملیح آبادی ... صہ
عرش و فرش ... " ... " ... للعہ
حسین اور انقلاب " ... عہ
شعرستان ... اختر شیرانی ... عہ
دھڑکنیں ... احمد ندیم ... عہ
الطاف کے گیت ... الطاف مشہدی عہ
گلبانگ حیات - امین حزیں ... سے
کفر و ایمان ... بہزاد لکھنوی ... عہ
تعلقہ - حاجی لقلق عہ ؛ منقار لقلق - عہ
گیت مالا ... صلاح الدین میراجی ... ۸ر
نقش چغتائی ... چغتائی ... عـ
مرقع چغتائی ... معہ

تاریخ
اسلام
سید امیر علی شاہ
کا
مکمل تین جلدوں
میں بامحاورہ
اور سلیس ترجمہ
از
باری علیگ
فی حصہ عہ
مجلد مکمل سہ حصہ
۸ر

نثر

رحمت اللعالمین، مکمل تین جلد ... قاضی سلیمان - معہ
مقالات جمال الدین افغانی مترجم سید ایم ڈی - ایم - اے - عـ
راہگذر - عاشق بٹالوی (افسانے) ... عـ
پطرس کے مضامین ... پطرس (مزاحیہ) ... عـ
مضامین فلک پیما ... (مزاحیہ) ... سے
کیلے کا چھلکا ... سندباد جہازی (مزاحیہ) ... عـ
گنجہائے گرانمایہ ... رشید احمد صدیقی ... عـ
گفت و شنید - بشیر ہاشمی - عـ ؛ گرد و پیش (افسانے) سے
خوفناک دنیا ... سید محمد علی شاہ (اول، دوم) ... سے
اردو ادب جنگ عظیم کے بعد ... ڈاکٹر عبداللہ ... ۱۲ر
خار و گل - ایم اسلم للعہ ؛ مزاحیہ ڈرامہ - خلیل ... عـ
ٹیپو سلطان - امجد علی عہ ؛ جرم و سزا - باری علیگ ... عہ
جاہ و جلال - تبسم عہ ؛ دروازہ - کرشن چندر ... عـ
شب غم - ایم اسلم عـ ؛ کروٹ - منٹو عہ ؛ منٹو کے مضامین عـ
لیلیٰ کے خطوط ... قاضی عبدالغفار ... عـ
اس نے کہا ... " ... عہ
مجنوں کی ڈائری ... " ... عـ
افسانہ زریں - اسمار طیب حسین عہ ؛ جواب - کرنل مجید ملک عہ
شمع ... اے آر خاتون (ناول) ... صہ
تصویر ... " ... " ... للعہ

نوٹ : مکمل فہرست کتب مفت طلب فرمائیں

اردو اکاڈمی لاہور

نگار

مدیر اعلیٰ: نیاز فتحپوری

جلد ۴۹	فہرست مضامین اپریل سنہ ۴۶ء	شمار ۴

ملاحظات ---------------------------- ۵

فانی کی شاعری کا دوسرا رُخ ----- ظہیر الدین احمد خاں - ام - اے (علیگ) --- ۹

گوسالۂ سامری ---------- ابوالجلال ندوی -------- ۱۷

ایک سوال --------- جمیل مظہری ام - اے -------- ۲۸

ترکی میں ابتدائی تعلیم -------- محمود علی خاں بی - اے -------- ۴۲

مالہٖ وماعلیہ ---------------------------- ۵۰

باب الاستفسار ---------------------------- ۵۲

بوڑھا کسان --------- پروفیسر شور (علیگ) -------- ۵۹

آں کہ من دانم (نظم) - جوش ملیح آبادی --- میری رہگزر ہیں (نظم) --- سلیمان اریب ۶۰

کلام شہید بدایونی ---------------------------- ۶۱

لمحۂ عشرت (نظم) -- اشعر ملیح آبادی --- غزل --- علی سجاد مہر اکبر آبادی ------ ۶۲

ملاحظات

ایک اور خطرۂ عظیم

جب تک جنگ جاری رہی، ہر شخص اپنی جگہ اس امید پر زندگی بسر کر رہا تھا کہ لڑائی ختم ہو جانے پر، پھر امن وعافیت کا دور آئے گا اور اہل ارض کی سرگرانیاں ختم ہو جائینگی لیکن اب کہ ہر چند یہ آگ بجھ چکی ہے، اس کی تپش و حرارت کا وہی عالم ہے اور باوجود اس کے کہ تلواریں نیام کے اندر کر لی گئی ہیں، لیکن آنکھوں سے خون اب بھی برس رہا ہے اور وہ چہرے جن کو کامیابی کے بعد شگفتہ ہو جانا چاہئے تھا، ہنوز فکرمند، افسردہ اور مضطرب ہیں — پھر یہ تشویش و اضطراب کیوں ہے، کیا اس لئے کہ فاسستی و نازسی قوت فنا نہیں ہوئی، کیا اس بنا پر کہ فاتح قوموں کی توقعات کامیابی پوری نہیں ہوئیں۔ نہیں، ان میں سے کوئی بات نہیں۔ بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک اور خطرۂ عظیم سے قریب تر پا رہے ہیں اور اس خطرہ کا باعث خود فاتح قوموں کے وہ ناخوشگوار تعلقات ہیں جن کی نوعیت قریب قریب وہی ہے جو جنگ شروع ہونے سے پہلے پائی جاتی تھی اور جس کا نتیجہ یقیناً تیسری جنگ ہے، اگر ان قوموں کی ذہنی و سیاسی کشمکش کا یہی عالم رہا۔

زبردست طاقتوں کا کمزور طاقتوں پر چھا جانا، بڑی قوموں کا اپنے درمیان کرۂ ارض کی تقسیم کے مسئلہ میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا، بین الاقوامیت کی آڑ میں جابرانہ قومی اقتدار کے قیام کی سعی آزادی چاہنے والی استعماری قوموں کی بے چینی، مالیاتی نزاع، صنعتی رقابت، سرمایہ دارانہ جبر و تشدد — یہ تھا دُنیا کا حال جس وقت پچھلی لڑائی شروع ہوئی اور بالکل یہی ہے اس وقت کی فضا، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ جو باتیں سنہ ۳۹ء میں باعث جنگ ہوئی تھیں، وہی سنہ ۴۶ء میں باعث امن و سکون ثابت ہوں! بلکہ اسوقت روس کے سامنے آجانے سے خطرات زیادہ سنگین ہو گئے ہیں اور ڈماکریسی و اشتراکیت کے باہمی تصادم کو روکنے کے لئے اب کوئی اور تیسری حکومت یا قوت درمیان میں حایل نہیں ہے۔

اس میں شک نہیں کہ نازسیت و فاسستیت کو اس جنگ نے ختم کر دیا، لیکن چونکہ اس میں بڑا ہاتھ اشتراکیت کا تھا اس لئے وسط یورپ کی وساطت سے جسے اب اشتراکیت کے قریب تر مطالعہ کا موقعہ ملگیا ہے، تمام ڈماکریٹک حکومتوں کی آبادی کو بھی یہ سوچنے کا موقعہ ملا، کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ دُنیا کا کھویا ہوا امن و سکون سرزمین روس ہی میں میسر آسکے اور یہ احساس ڈماکریٹک حکومتوں کے لئے یقیناً بہت فکر کی بات ہے۔ اس لئے اب صورتِ حال

یہ ہے کہ ایک طرف روس (اس خیال سے کہ مبادا ڈکٹریٹک حکومتیں پھر اس پر حملہ آور ہوں) اپنے اقتدار کے حدود کو زیادہ وسیع و مضبوط بنانا چاہتا ہے اور دوسری طرف برطانیہ و امریکہ ان بالشیوک اثرات اور روسی اقدامات کو دیکھ دیکھ کر خایف ہیں کہ کہیں یہ زہر ان کے ملکوں تک نہ سرایت کر جائے۔

ایران میں روس کا قدم جمانا، ترکی سے اس کے بعض علاقوں کا مطالبہ کرنا، ریاستہائے بلقان کی حکومتوں پر اس کے اقتدار کا بڑھتے جانا، برطانیہ و امریکہ کے لئے بڑے خطرہ کی چیزیں ہیں، اور اگر ایران و روس کی نزاع کسی طرح دور نہ ہوئی اور روس نے ترکی پر حملہ کر دیا، تو یقیناً پھر ساری دنیا میں آتشِ جنگ مشتعل ہو جائے گی اور چونکہ یہ لڑائی اٹم بم کی ہوگی، اس لئے اس کی تباہیاں ظاہر ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ روس کی موجودہ پالیسی بھی (چھوٹی قوموں کو دبانے کی حد تک) اتنی ہی بُری ہے جتنی ڈماکریٹک حکومتوں کی استعماری پالیسی، لیکن چونکہ اسوقت لڑائی Industrialism (صنعتی مسابقت) کی ہے، اس لئے روس کے لئے ناممکن ہے کہ وہ اس سے علحدہ ہو کر اپنی ہستی کو قایم رکھ سکے اور مجبور ہے کہ وہ بھی انھیں ذرایع سے کام لے جن سے ڈماکریٹک حکومتیں کام لے رہی ہیں۔ اور جن کی بنیاد یکسر بے اعتباری اور شکوک و اوہام پر قایم ہے۔

پچھلی لڑائی کے بعد دُنیا میں امن و سکون قایم رکھنے کی تدبیر یہ بتائی گئی تھی کہ اسلحہ سازی کو کم کر دیا جائے اور آلات و ذرایع جنگ کو بہت محدود کر دیا جائے، لیکن باوجود اس کے لڑائی ہوئی اور امن قایم نہ رہ سکا۔ اب اس لڑائی کے بعد قیام امن کی صورت یہ بتائی جاتی ہے کہ فوجی طاقت کو ہر ممکن حد تک بڑھا دیا جائے اور حملہ و دفاع کے لئے بڑی سی بڑی طیاری کی جائے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ فیصلہ پہلے فیصلہ سے زیادہ خطرناک ہے، کیونکہ اُس کی بنیاد بڑی حد تک اعتبار پر تھی اور اسلحہ سازی کی کمی کی ایک آخری حد یہ بھی مقرر ہو سکتی تھی کہ اسے بالکل ختم کر دیا جائے، لیکن یہ فیصلہ تو بالکل بے اعتمادی اور بے اعتباری پر قایم ہے اور فوجی طیاریوں کی آخری حد کوئی متعین نہیں کی جا سکتی، علاوہ اس کے یوں بھی جب ساری قوت فوجی طاقت کے بڑھ جانے پر صرف کر دی جائیگی تو ایسے وقت کا آنا ناگزیر ہے (جیسا کہ جرمنی میں آیا تھا) کہ بے شمار فوجوں کا تعطل دور کرنے اور اُن کے بڑھے ہوئے مصارف پورے کرنے کے لئے، اُن سے کام لیا جائے اور وہ کام صرف یہی ہو سکتا ہے کہ دوسرے ملکوں پر قبضہ کیا جائے اور کمزور قوموں سے اپنے ناجایز مطالبات زبردستی پورے کرائے جائیں۔

بہر حال جیسا کہ خیال تھا اس جنگ کا اختتام دنیا کے لئے کوئی امن و سکون نہیں لایا ہے اور اتحادیوں کا یہ دعویٰ کہ وہ یہ لڑائی امن جیتنے کے لئے لڑ رہے ہیں، بالکل غلط نکلا۔ اور دُنیا پہلے سے زیادہ خطرہ میں ہے

ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کیا ہوگا، اس کے متعلق تو دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں۔ لیکن کب ہوگا اس کی بابت البتہ اختلاف ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ تو بالکل طے ہو چکا ہے اور یہ فیصلہ چونکہ خود ملک و اہل ملک نے کیا ہے اس لئے اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں اور نہ اس باب میں اب کسی سے سوال و مطالبہ کرنا ہے بلکہ صرف آزادی کا اعلان کرنا ہے اور اس اعلان کی تاریخ و نوعیت ہی کے متعلق رائے زنی ہو سکتی ہے۔

ظاہر ہے کہ اسوقت تک ہندوستان کی آزادی کی راہ میں جو چیز حایل رہی اور ہے، وہ کانگرس اور مسلم لیگ کا اختلاف ہے۔ اور حکومت اس اختلاف کو بہانہ قرار دے کر آزادی کے مسئلہ کو ہمیشہ ملتوی کرتی رہی، لیکن اب حالات بہت بدل گئے ہیں اور اس بہانہ کی عمر ختم ہوتی نظر آتی ہے۔

اس سے قبل ہندوستان کا مسئلہ آزادی متعدد بار برطانیہ کے سامنے آیا اور اس نے اپنے خلوص نیت کے اظہار کے لئے بارہا یہاں کمیشن بھی بھیجے، ملک کے ہر طبقہ کے لیڈروں سے گفت و شنید بھی کی، لیکن وزیر ہند نے خود یہاں آنے کی تکلیف کبھی گوارا نہ کی تھی اور اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اگر "کیبنٹ مشن" کوئی نیا حیلہ اختراع کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی، تو ملک کی آزادی اب دور نہیں ہے۔

اس وقت ہندوستان میں تین گروپ ہیں، جن کے اتحاد و اتفاق پر نتیجہ کا انحصار سمجھا جاتا ہے:۔۔۔ کانگرس، مسلم لیگ، ریاستیں اور ان میں اہم ترین اختلاف یہ ہے کہ کانگرس متحدہ ہندوستان کے لئے ایک ہی کانسٹی ٹیوشن، ایک ہی آئین چاہتی ہے، مسلم لیگ، پاکستان کے لئے علیحدہ آزاد کانسٹی ٹیوشن کا مطالبہ کرتی ہے اور ریاستیں، ملک آزاد ہونے کے بعد بھی اپنے تعلقات ملک معظم کی حکومت ہی سے قایم رکھنا چاہتی ہیں۔ اور اگر ان تینوں جماعتوں میں سے ہر ایک اپنے مطالبہ پر قایم رہی، جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے تو یہ گتھی سلجھتی نظر نہیں آتی۔

ہر چند وزیر اعظم مسٹر اٹیلی نے یہ صاف صاف کہدیا ہے کہ کسی اقلیت کی بیجا ضد کی وجہ سے اکثریت کے مطالبات آزادی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور اس "بیجا ضد" کا معیار یہ مقرر کیا گیا ہے کہ اگر کوئی اقلیت اپنے مطالبات میں دس فی صدی رواداری بھی گوارا نہیں کر سکتی تو یہ اس کی بیجا ضد سمجھی جائے گی، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ عملی حیثیت سے بھی اس اصول کی پابندی کی جائے گی یا نہیں۔

وزیر ہند نے ہندو مسلم قومیت کے متعلق جو خیال ظاہر کیا ہے، وہ بہت لچکدار ہے، ایک طرف وہ مسلمانوں کو اقلیت کی حیثیت سے بلند تسلیم کرتے ہیں اور دوسری طرف صاف صاف ان کو جداگانہ قوم (Nation) نہیں کہتے بلکہ ایک بڑی جماعت (Community) قرار دیتے ہیں ——— اور قوم و جماعت

کا فرق ظاہر ہے -

بہر حال اپریل ۱۹۴۶ء ہندوستان کے لئے بڑا اہم مہینہ ہے اور ناکامی و کامیابی دونوں صورتوں میں صفحات تاریخ پر غیر فانی نقوش چھوڑ جانے والا ہے، کیونکہ بہ صورت کامیابی آزادی ملک کی تاریخ اس سے شروع ہوتی ہے و بصورت ناکامی یہ اُس جدوجہد کا آغاز ہوگا، جس کا نتیجہ دنیا میں ہمیشہ ایک ہی ہوا ہے -

یوپی کی کانگرسی وزارت

آج یکم اپریل کو یوپی کی عنان حکومت پھر انھیں ہاتھوں میں نظر آتی ہے، جنھوں نے چند سال قبل اس کو خود چھوڑ دیا تھا، یعنی وہ منحوس و نامبارک زمانہ پھر آگیا جس کے دور ہونے پر مسلم لیگ نے "یوم نجات" منایا تھا -

انتخاب کے نتائج نہ صرف یوپی بلکہ تمام ہندوستان میں اس حقیقت کو ثابت کر چکے ہیں کہ کانگرس نہ صرف ہندو قوم کی نمایندہ ہے، بلکہ ان علاقوں کے مسلمانوں کی بھی نمایندہ ہے جہاں ۹۰ فیصدی مسلمانوں کی آبادی ہے، اور ہندوستان کی تمام آبادی میں نصف سے بھی کم کی نیابت مسلم لیگ کو حاصل ہے لیکن یوپی کی وزارت میں باوجود صدر کانگرس کی انتہائی رواداری کے قاید اعظم نے مسلمان ممبروں کو حصہ لینے کی اجازت نہیں دی اور عذر یہ پیش کیا گیا کہ وہ غیر کانگرسی مسلم ممبروں کے ساتھ ملکر کام نہیں کر سکتے -

اس میں شک نہیں کہ اس وقت یوپی کی کانگرس حکومت کے سامنے بڑے بڑے اہم مسایل درپیش ہیں اور کوئی حکومت ملک کی تکالیف دور کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتی، جب تک خود اہل ملک تعاون کے لئے آمادہ نہ ہوں، لیکن اسی کے ساتھ ارباب وزارت کو بھی چاہئے کہ وہ اپنی پچھلی غلطیوں پر غور کریں اور جو تجربہ اس سے قبل انھیں حاصل ہو چکا ہے، اس سے فایدہ اُٹھائیں -

یوپی کی کانگرس حکومت کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ یہاں کے مسلمانوں کو اپنی طرف سے پُر دل نہ ہونے دے اور کوئی ایسا طرز عمل اختیار نہ کرے جو عصبیت کا ادنیٰ شائبہ بھی رکھتا ہو -

اگر پچھلے واقعات فراموش نہیں ہوئے ہیں تو ڈاکٹر کٹجو اور مسٹر سمپورنانند کو معلوم ہوگا کہ مسلم لیگ کے دوبارہ احیاء کے ذمہ دار زیادہ تر وہی ہیں، اور یوپی کے اکثر مسلمان صرف اس لئے کانگرس سے کٹ کر مسلم لیگ میں شامل ہوئے کہ اُردو ہندی نزاع کے مسئلہ میں انھوں نے علانیہ عصبیت سے کام لیکر اُردو کو نقصان پہونچانے کی کوشش کی، اور یہ اتنی بڑی سیاسی غلطی تھی جسکا کوئی دانشمند انسان دوبارہ مرتکب نہیں ہو سکتا -

کتب موصولہ

ہمیں افسوس ہے کہ اسوقت تک ہم کتب موصولہ پر ریویو شایع نہیں کر سکے، جس کا بڑا سبب یہ تھا کہ سالنامے کے دو حصے کرنا پڑے اور جنوری سے مارچ تک ریویو کی گنجایش نہ نکل سکی کتابیں کثرت سے جمع ہوگئی ہیں تاہم امید ہے کہ مئی اور جون میں ان سب پر ریویو ہو جائے گا -

فانی کی شاعری کا دوسرا رُخ

مارچ، اپریل اور مئی ۴۵ء کے معارف میں جناب مرزا احسان صاحب نے فانی پر قسط وار مضمون لکھے ہیں اور ان کی تمام تنقید کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ: "فانی ہر وقت روتے ہیں منھ بناتے ہیں۔ عشق و محبت کی آتش فشانیاں کم ہیں درد و غم سے گھبرا کر ہر وقت موت کے آرزومند ہیں، اپنی ذاتی ناکامیوں کا ماتم کرتے ہیں، سینہ کوبی اور گریہ و زاری انکا شیوہ ہے، اہل لکھنؤ کی طرح ان کے نزدیک بھی عشق ایک مرض ہے، جنازہ، میت، کفن، لحد، مزار اور شمع وغیرہ کی بھرمار ہے وغیرہ وغیرہ"۔ قریب قریب یہی تنقید بلکہ اس سے سخت جوش ملیح آبادی نے فانی پر کی ہے۔ انھوں نے "بیوۂ عالم، سوز خوان، ہر وقت بسورنے والا اور انسانیت کے درجہ سے گرا ہوا، اور دل کو ہمیشہ آستین پر لٹکائے ہوئے" کہنے میں بھی دریغ نہیں کیا۔ لیکن بقول آل احمد سرور صاحب جوش کی نثر ایک قسم کی ہسٹیریا ہے۔

کسی شاعر پر تنقید کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس کے ماحول اور اس کے نظریۂ شاعری کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے نقاد اسی وقت ہسٹیریا کا شکار ہوتا ہے جبکہ اس کا دل شاعر کے دل کا ساتھ نہ دے اور اس کا دماغ شاعر کے دماغ کے ساتھ پرواز نہ کر سکے۔ اگر شاعر نے اپنے کلام میں اپنے دلی جذبات کو من وعن اچھے اور دلکش الفاظ میں بیان کر دیا تو پھر وہ شاعری کے اُصول پر پورا اُتر گیا۔ احسان صاحب کو یہ اعتراض ہے کہ: "خانگی آلام و مصائب کا تغزل میں تذکرہ کرنا کسی طرح جایز نہیں ہے"۔ لیکن اگر تغزل میں دل کی باتیں کہی جاتی ہیں، اور شاعر اپنے دماغ سے سوچتا ہے اور چیزوں کو اپنے ہی طریقہ پر محسوس کرتا ہے تو اس کے ذاتی تاثرات کا ظاہر ہونا ضروری ہے، اگر شاعر آپ بیتی چھوڑ کر جگ بیتی پر اُتر آئے تو ہم اسے خارجی شاعری کہتے ہیں جس کے لئے لکھنؤ اسکول ابتک بدنام ہے۔ تغزل کو حسن و عشق، محبت اور گل و بلبل تک محدود کر دینا اور پرانی ڈگر پر قایم رہنا تغزل کی روح کو نہ سمجھنا ہے، غزل ہر قسم کے مضامین کو اپنے اندر سمو لیتی ہے اگر میر کے یہاں ایک طرف بے چینی، افلاس، کرب، حسن و عشق کے جذبے کارفرما ہیں تو دوسری طرف فلسفیانہ گتھیوں کو بھی سلجھایا گیا ہے اور تصوف کے رازہائے سربستہ بھی بے نقاب کئے گئے ہیں۔ غالب کی شاعری کا موضوع اگر صرف عشق و محبت ہی سمجھ لیا جائے تو ان کی شاعری میں اس قسم کے بہت تھوڑے سے اشعار ملیں گے غالب نے بھی عشق و محبت کے ساتھ ساتھ اخلاق و تصوف اور فلسفہ کو اپنی شاعری میں دخل دیا ہے، فلسفہ تو انکی شاعری کی جان ہے۔ فانی کا بھی یہی حال ہے انھوں نے جوانی کے صدموں سے متاثر ہو کر صرف حسن و عشق ہی کو

اپنی شاعری میں، جگہ نہیں دی بلکہ تصوف، اخلاق و فلسفہ کا بھی ذکر کیا ہے۔

اگر ہم خود شاعر کے بتائے ہوئے نظریہ شاعری کو پڑھیں تو زیادہ بہتر ہے۔ رسالہ سب رس کے ریڈیو نمبر میں فانی مرحوم کی ایک تقریر درج ہے جس کا ہم مختصراً ذکر کرتے ہیں:

"میں شعر اور نظم محض میں فرق کرتا ہوں، اگرچہ نظم کے خد و خال اکثر و بیشتر شعر سے ملتے جلتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ ہر نظم شعر کا مرتبہ پا سکے۔ شعر کے لئے جو سب سے زیادہ ضروری چیز ہے وہ شعریت ہے، سب سے زیادہ میں اس لئے کہتا ہوں کہ اگر شعر شعریت سے عاری ہے تو موزونیت اس کی تلافی نہیں کر سکتی۔ ہاں اسے صرف نظم کا درجہ دیا جا سکتا ہے بہر حال میں موزونیت کو لوازم شعر میں دوسرا درجہ دیتا ہوں۔ بالفاظ دیگر میں موزونیت کو شعر میں اتنا ضروری نہیں سمجھتا جتنا شعریت کو کلام موزوں بھی شعر ہوتا ہے بشرطیکہ وہ مظہر کیفیات قلب ہو۔ بعض فقرے بعض جملے اور بعض الفاظ بھی شعر ہو سکتے ہیں ایک آہ ایک اف اور شاید کیا یقیناً بعض حالات میں ایک نگاہ بھی شعریت کی حامل ہوتی ہے بہر صورت شعر کے جانچنے کا صحیح معیار صرف شعریت ہے اور بس .... شعرا کو کسی خاص غیر شاعرانہ مقصد کے حصول کے لئے آلۂ کار نہیں بنایا جا سکتا۔ خواہ وہ مقصد کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ شعر کا حاصل خود شعر ہے، شعر انسان بلکہ تمام عالم موجودات کے وجود اور اس کی غیر محدود کشاکش حیات سے تعلق رکھتا ہے۔ یہی تو وہ درس ہے کہ فطرت جب چاہتی ہے اور جسے چاہتی ہے خود سکھاتی ہے۔ اور جب تک فطرت خود نہ سکھائے کوئی شاعر شاعر کہلانے کا مستحق نہیں ہوتا۔

..... حقیقی شاعری کوئی افادی پہلو نہیں رکھتی۔ اس لئے شاعر کو مصائب کا شکار ہونا لازمی ہے .....

شاعر جس ماحول میں پیدا ہوتا ہے وہ اس کا ماحول نہیں ہوتا وہ زمانہ مستقبل کا انسان ہوتا ہے ...."

فانی نے شاعری کے افادی پہلو سے جو انکار کیا ہے اس سے ان کی مراد مادی افادیت ہے۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ حقیقی شعر عطیہ فطرت ہونے کے باوجود بیکار محض ہے۔ حقیقی شعر اہل دنیا کی آنکھوں سے خود اس کی نگاہوں کا حجاب اٹھانے کے لئے خلق کیا گیا ہے۔ فانی خالص شاعری کے قایل ہیں وہ شاعری کے لئے شعریت اور موزونیت چاہتے ہیں شاعری کا معاملہ دل کا معاملہ ہے جو دل سے نکلتی ہے اور دل پر اثر کرتی ہے شاعری جذبات و تاثرات حسیات قلبی اور کیفیات دل کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ شاعر اپنی شاعری اپنے خون سے سینچتا ہے۔ بقول سید سلیمان ندوی "غزل کے لکھنے کے لئے سیاہی بازار کی بوریوں میں نہیں ملتی بلکہ خونچکاں سینے میں پائی جاتی ہے اس کے لئے زخمی دل درکار ہے۔ اسی لئے اقبال نے بھی کہا ہے "مصرعہ من قطرۂ خون من است"۔ "قطرۂ خون" اسی وقت شاعری میں ٹپکتا ہے جبکہ شاعر کا خلوص اس میں کارفرما ہو۔ شعر میں شعریت کے ساتھ ساتھ تاثیر کا ہونا بھی ضروری ہے اور تاثیر میں گہرائی بغیر خلوص کے پیدا نہیں ہو سکتی۔ فانی اپنا ایک مخصوص اسلوب رکھتے ہیں اور اس میں ان کی ذاتی اور شخصی بصیرت ٹپکتی ہے۔ اسلوب میں انفرادیت کا ہونا بہت ضروری ہے جیسا کہ کہا گیا ہے "شخص ہی طرز ہے"

Style is the man اسلوب میں خلوص کا ہونا ضروری ہے لیکن خلوص اسوقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ انداز بیان پر قدرت نہ حاصل ہو۔ فانی اپنے خلوص اپنے انداز بیان اور اپنے دھیمے اور دلکش سروں سے پہچانے جاتے ہیں۔

فانی کے کلام کا مطالعہ کرتے جائیے ان کی زندگی کے اوراق خود بخود اُلٹتے جائیں گے۔ ان کی شاعری انکی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ ہر ہر لفظ ان کی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ وہی شاعری بلند پایہ ہوگی جس کو شاعر نے خود محسوس کیا ہو۔ زندگی کی چکی میں جس نے اپنے کو خود پیسا ہو اور زندگی کی بھٹی میں جس نے اپنے کو خود سُلگایا ہو، اس سے جو آواز نکلتی ہے وہ شاعری ہے۔ میر اپنی زندگی کا دُکھڑا اپنی شاعری میں بیان کر گئے اور اسی لئے سرتاج الشعراء کہے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ غالب نے بھی انھیں اُستاد مانا اور ذوق بھی ان کے انداز بیان پر سر دھنتے رہے۔ غالب کی شاعری بہت تنوع پسند ہے۔ زندگی کی ہر شاہراہ پر غالب کا توسن فکر دوڑتا رہا۔ کبھی مایوسیوں کا منھ دیکھنا پڑا اور کبھی کامیابیاں بھی ہوئیں۔ غدر کے ہنگامے بھی دیکھے اور اس کے پہلے کی خوشحالی بھی دیکھی۔ ماحول تبدیل ہوتا گیا ان کی شاعری میں تنوع آتا گیا۔

فانی کا سلسلۂ نسب فرمانروایان افغانستان تک پہونچتا ہے۔ آپ کے پرنانا نواب بشارت علی خاں گورنر صوبہ بدایوں تھے۔ ان کی جائداد ۳۸۴ مواضع پر مشتمل تھی لیکن یہ جائداد نذر غدر ہوگئی، ۱۲ سو روپیہ ماہوار کی جائداد فانی تک پہونچی۔ لیکن بے اعتدالیوں کی وجہ سے وہ بھی جاتی رہی۔ فانی بچپن ہی سے شعروشاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ بچپن میں ان کے والد بزرگوار نے سختی سے ان کو شعروسخن سے روکا۔ ۱۹۱۷ء میں والد کے انتقال کے بعد جہاں شعروسخن کا چرچا شروع ہوا وہاں قرضہ اتنا چڑھا کہ بقالوں نے نالش کی دھمکیاں دینی شروع کیں۔ خود وکیل تھے ہر چیز کو اچھی طرح سمجھتے تھے لیکن خودداری اور غیرت کے مارے عدالت نہیں جاتے تھے اور ہر نقصان برداشت کرنے کے لئے طیار تھے آخر کار جائداد کو ۲۰ ہزار میں بیع کر کے بقالوں سے پیچھا چھڑایا۔

اوائل ۱۹۳۲ء میں فانی ہز اکسلنسی مہاراجہ سرکرشن بہادر شاد کی طلبی پر حیدرآباد تشریف لے گئے حیدرآباد پہونچکر جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس کا اندازہ فانی کے اس مختصر خط سے ہوتا ہے جو انھوں نے ۲ جون ۳۳ء کو حکیم مختار احمد صاحب بدایونی کو لکھا ہے:-

"میرا تقرر ہنوز نہیں ہوا ہے، دیکھئے کب ہوتا ہے اور کہاں یا غالباً ہوتا ہے بھی یا نہیں ......"

فانی کو حیدرآباد میں ملکی اور غیر ملکی جھگڑوں سے دوچار ہونا پڑا۔ آخر کار دارالشفا ہائی اسکول بلدہ میں ہیڈ ماسٹری کے عہدہ پر فائز کر دئے گئے۔ ابھی سکون بھی نہ لینے پائے تھے کہ دوسری جگہ تبادلہ ہوگیا۔ اور اسی دوران میں ان کی رفیقۂ حیات اور محبوب بیوی کو مرض آکلہ کی شکایت ہوئی اور اسی مرض میں ان کا انتقال بھی ہوگیا۔

ادھر مہاراجہ بہادر نے بھی دُنیا سے ہمیشہ کے لئے منہ موڑ لیا۔ ۱۹۳۶ء میں ان کی جوان لڑکی کے انتقال نے انکی دنیا اُجاڑ ڈالی، فانی کو اس سانحہ سے بے انتہا صدمہ پہونچا۔

فانی جہاں جہاں گئے ناکامیوں اور مایوسیوں نے ان کا خیر مقدم کیا چونکہ فانی ایک حساس دل لیکر پیدا ہوئے تھے اس لئے ان کی شاعری بھی ناکامیوں اور سوز و گداز سے بھری ہوئی ہے۔ حیدر آباد میں جو آخری ایام انھوں نے کاٹے ہیں وہ یقیناً بہت افسوس ناک ہیں۔ حیدر آباد کا مشہور پیام اخبار لکھتا ہے:۔

"حیدر آباد کے عصر حاضر میں اس سرزمین پر شاید ہی کوئی ایسا صاحب کمال اس کس مپرسی کی حالت میں دفن ہوا ہو جس حالت میں کہ فانی نے اپنی زندگی کے چند آخری سال گزارے"۔

یہ ہے فانی کی مختصر سوانح اور ان کی زندگی کے چند مٹے ہوئے نقوش۔ ان کی شاعری پر تنقید کرنے سے پہلے ان چیزوں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

فانی نے جب ہوش سنبھالا اسوقت فضا داغ کے نغموں سے گونج رہی تھی۔ آزاد، حالی اور اکبر نے اپنے اپنے جھنڈے گاڑ رکھے تھے۔ حالی نے غزل کے لئے نئے سانچے طیار کئے اس نئی تحریک سے ہر شخص متاثر ہوا، فانی بھی اس سے بچ نہ سکے۔ فانی نے یہ سوچ لیا کہ غزل کی شاعری ہمیشہ برقرار رہنے والی ہے انھوں نے اس میدان میں قدم رکھا اور آزادانہ اس میں سبک خرامی کرتے رہے۔

فانی کے زمانہ میں لکھنؤ کی انگیا، چوٹی، سرمہ، مستی کی شاعری ختم ہو رہی تھی۔ اور اس کی جگہ مرثیہ لے رہا تھا۔ ان دنوں لکھنؤ کے شاعروں کو رنج و غم، گریہ و ماتم، گور غریباں اور یاس و حرماں کے سوا کچھ بھی نہیں سوجھتا تھا۔ یہانتک کہ غزل پر بھی مرثیت کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ یہ رنگین شاعری کا ردعمل تھا جو عرصہ تک لکھنؤ کے شاعروں کے دلوں کو گرما چکی تھی۔ اور جب اس کا ردعمل شروع ہوا تو وہاں کے شاعروں نے اس کو بھی انتہا پر پہونچا دیا اس میں بھی تصنع اور بناوٹ بڑی حد تک جگہ پانے لگی۔ واجد علی شاہ اختر لکھنؤ کو چھوڑ کر مٹیا برج سدھارے، رنگین محفلیں سونی پڑ گئیں۔ اور اس کا نتیجہ حزن و یاس اور رنج و الم کی صورت میں نمودار ہوا۔ فانی اس سے بہت زیادہ متاثر ہوئے انکی طبیعت تیر جیسی واقع ہوئی تھی اور ذرا ذرا سی بات کا وہ دل پر اثر لیتے تھے۔ اس لئے وہ المیہ آرٹ کو بہت زیادہ پسند کرتے تھے۔

فانی شروع شروع میں غالب کے انداز بیان اور ان کے فلسفہ سے زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ یہ باقیات میں ان کی زندگی صاف جھلکتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ لکھنؤ کے زمانہ میں ان میں لکھنویت آگئی۔ "کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ" والی غزل اسی لکھنویت کی آئینہ دار ہے۔ فانی کے یہاں لکھنویت دو شکلوں میں نمایاں ہے، ایک تو صنعتی، انداز بیان میں چستی اور مروجہ تشبیہات کے استعمال ہیں اور دوسری نمایاں چیز ماتمی لے ہے۔ عزیز و ثاقب کے مقابلہ میں فانی کا یہ ماتمی

رنگ زیادہ پختہ اور دیرپا ہو گیا ہے۔ فانی بعد کے لکھنؤ اسکول سے متاثر معلوم ہوتے ہیں مگر ان کے یہاں رعایت کی بھرمار نہیں ہے چونکہ ماتمی رنگ ان کی طبیعت کے موافق ہے اس لئے زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ حسرت اور میر سے متاثر معلوم ہوتے ہیں، میر کی سادگی اور حسرت کی پُرکاری کا انداز ان میں جھلکتا ہے۔ آخر میں جو ان کے یہاں غالبیت ہے وہ ابتدا کی غالبیت سے بالکل جدا ہے۔ آخر میں ان کے یہاں ایک مخصوص انداز فکر ملتا ہے۔ حیات و کائنات پر جزئیات سے کلیات بنانے کا فن ملتا ہے۔ اس میں وہ قنوطی رنگ ملا دیتے ہیں جو ان کی عالمگیریت کا مترادف ہو جاتا ہے لیکن یہاں وہ غالب سے کم درجہ پر آتے ہیں اور میر سے قریب تر ہو جاتے ہیں۔ انداز بیان میں غالب سے میر کی طرف چلتے ہیں، یعنی میر جیسی چھوٹی چھوٹی بحریں استعمال کرتے ہیں۔ اس منزل پر پہونچ کر روانی اور تاثیر بڑھتی جاتی ہے میر کے غیر معمولی احساس کی شدت کے مقابلہ میں فانی کے یہاں فکر کی مکمل عکاسی ملتی ہے، فانی اپنے یہاں مختلف سانچے رکھتے ہیں اور ہر سانچہ ان کو ایک دوسرے سے قریب لے جاتا ہے۔ غالب کے بعض اشعار میں تھوڑی سی تبدیلی کی ہے لیکن آپ اسے سرقہ نہیں کہہ سکتے اس میں ان کا قنوطی پہلو اور ان کا رنگ جھلکتا ہے۔

فانی:- کچھ نہ وحدت ہے نہ کثرت ہے نہ حقیقت نہ مجاز — یہ ترا عالم مستی وہ ترا عالم ہوش

غالب: ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ، — عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

فانی: ہے کہ فانی نہیں ہے کیا کہئے، — راز ہے بے نیاز محرم ناز

غالب: ہاں کھائیو مت فریب ہستی — ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے،

فانی: قطرہ قطرہ رہتا ہے دریا سے جدا رہ سکنے تک — جو تاب جدائی لا نہ سکے وہ قطرہ فنا ہو جاتا ہے

غالب: عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

فانی: بہلا نہ دل نہ تیرگی شام غم گئی — یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

غالب: لو! وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے — یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

فانی: چارہ گر ناصح مشفق دل بے صبر و قرار — جو ملا عشق میں غمخوار وہ ناداں نکلا

غالب: بوئے گل نالۂ دل دود چراغ محفل — جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

یہاں پر غالب اور فانی کا موازنہ مقصود نہیں ہے بلکہ دونوں کے اشعار پیش کر کے دونوں کی مماثلت دکھانا مقصود ہے۔ غالب کا شعر ان کے خاص رنگ میں ہے وہی شوخی اور چستی جامعیت اور ہمہ گیریت ہے۔ فانی اپنے انداز بیان کی چستی، اپنے خلوص، اپنی تاثیر اور اپنے قنوطی رنگ کو نہیں چھوڑتے۔

فانی کے یہاں کہیں کہیں حسرت کا نفسیاتی مشاہدہ بھی ملتا ہے فانی کے یہاں تکرار بھی پائی جاتی ہے لیکن اسمیں بھی فنکاری ہے یہ تکرار عجز کے بجائے قدرت رکھتی ہے۔ ان کے محاوروں میں غیر معمولی قدرت ملتی ہے اس ازیچ پر

پہونچکر فانی کا قنوطی رنگ ایک طریقہ سے حقیقت شناس بن جاتا ہے۔ کشمیر کے متعلق جو فانی کی رباعی ملتی ہے، اسمیں بھی ان کا قنوطی پہلو صاف نمایاں ہے - ان کی قنوطیت مرض نہیں ہے حیات و کائنات ان کو سکرٹی ہوئی نہیں معلوم ہوتی بلکہ حیات کے تمام رازہائے سربستہ بے نقاب ہو جاتے ہیں ان کی غیر معمولی فنکارانہ حسیتی ان کی قنوطیت کو انبساط کا رنگ دے دیتی ہے یہ مانا کہ اقبال اور غالب جیسی جامعیت ان کے یہاں نہیں ملتی۔ فانی کی عظمت ان کا فلسفہ نہیں ہے بلکہ واردات قلبیہ ہے جس کو فانی نے بڑے اچھے انداز میں بیان کیا ہے۔

آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ امڈا آتا ہے   دل پر گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

الفاظ کو غلام بنانا اور دل کی مصوری کرنا فانی ہی کا حصہ تھا۔

میر کا رنگ فانی کے بعض اشعار میں میر کا اتنا رنگ ہے کہ مشکل سے پہچانے جا سکتے ہیں:

چارہ تپ ہجر کا اب کیا کروں،   زہر بھی کمبخت دوا ہو گیا،
اب بھی ترا وعدہ وفا ہو نہ ہو   موت کا وعدہ تو وفا ہو گیا،
اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا   زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا،
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم   رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم
یا کہتے تھے کچھ کہتے جب اسنے کہا کہیے   تو چپ ہیں کہ کیا کہیے کھلتی ہے زباں کوئی

غالب کا رنگ غالب کے رنگ میں فانی کا کلام بہت زیادہ ہے بعض پوری پوری غزل غالب کے رنگ میں ہے

ہو بھی چکے تھے دام محبت میں ہم اسیر   عالم ابھی بقید زمان و مکاں تھا
اللہ رے بے نیازیِ آدابِ التفات   دیکھا مجھے تو پائے نظر درمیاں نہ تھا
ہے مژدہ نگاہ غلط، جلوہ خود فریب   عالم دلیل گمرہیِ چشم و گوش تھا

مومن کا رنگ مومن کے یہاں جہاں خیال کی بلندی ہے وہاں الجھن بھی ہوتی ہے فانی کے یہاں اتنی الجھن تو نہیں ہے لیکن بلند مفہوم ہونے کی وجہ سے شعر مشکل ہو جاتا ہے۔

مرا وجود ہے میری نگاہ خود نشناس   وہ راز ہوں کہ نہ ہوتا جو راز داں ہوتا،
کمال ضبط غم عشق اے معاذ اللہ   کہیں کہیں سے جو یہ ماجرا بیاں ہوتا
تم سے نسبت ہے اعتبار اپنا   ہم تمہارے ہیں ورنہ پھر ہم کیا
یہ بھی اک التفات ہے ورنہ   دعوت نالہ ہائے پیہم کیا

اس سے فانی اور غالب، مومن اور میر کا مقابلہ کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ فانی کے ماحول اور انکی شاعری کے سمجھنے میں یہ چیزیں ہمیں مدد دیتی ہیں۔

ہم جس انسان کے منتظر ہیں، اور جس انسان کے گوشت و پوست بنانے میں شاعری اور ادب کا بہت زیادہ دخل ہے وہ انسان فانی کی شاعری میں نمایاں ہے۔ حافظ کی شاعری میں، خیام کی رباعیوں میں، کالیداس اور فردوسی کے اشعار میں رومی کے جواہر ریزوں میں اور غالب کی نشتریت میں ہم کو ایسے انسان کی جھلک ملجاتی ہے۔ فانی کے یہاں جو چیز ہمیں ملتی ہے وہ ان کی روحانی ناکامی ہے۔

زندگی غم اور خوشی سے عبارت ہے، بقول برنارڈ شا "احمق آدمی خوش رہنا چاہتا ہے"۔ نطشے کا قول ہے کہ "درد کے روحانی بننے کا نام ناکامی ہے"۔ ولیم جیمس خوشی اور نشاط کو زندگی کا مسئلہ نہیں مانتا، مگر غم کو زندگی کا مسئلہ مانتا ہے۔ بہرحال جب سے دنیا قایم ہے انسان غم و نشاط، اضطراب و سکون، دکھ سکھ، درد و راحت کا مجموعہ ہے اور رہتی دنیا تک وہ ان دو مضبوط پنجوں سے نجات نہیں پا سکتا۔ یہی دو عناصر انسان کی زندگی میں پیوست ہو جاتے ہیں اگر وہ شاعر ہے تو اس کی شاعری میں رونما ہوتے ہیں۔ غم اگر منزل زندگی نہیں ہے تو خوشی بھی منزلِ مقصود نہیں کہی جاسکتی۔ انسان کا خمیر انھیں دو چیزوں سے طیار ہوا ہے۔ اور یہی چیزیں اس کی زندگی کی پرتو ہیں فانی کی زندگی مصیبتوں کا ایسا مجموعہ ہے جس میں ان کے دل کی کلی کبھی نہیں کھلی۔ انکا دل غموں سے نڈھال ہے اور ان کا ٹوٹا ہوا دل ان کے صفحات میں بکھرا ہوا ہے۔ برنارڈ شا نے اپنے ایک ناٹک میں لکھا ہے کہ "ٹوٹا ہوا دل اور بھری ہوئی جیب انسان کو بہت موافق آتے ہیں"۔ مارکس اینڈریو شاعری کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"شاعری رنج والم کی بہن ہے ہر وہ شخص جو تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے اور آنسو بہاتا ہے وہ شاعر ہے ہر آنسو ایک شعر ہے اور ہر دل ایک نظم"۔

فانی اسی کے ہمنوا ہیں اسی لئے ان کا آرٹ بھی المیہ ہے۔ ظاہر ہے جب اس زخمی دل سے شاعری کے چشمے پھوٹیں گے تو اس میں سے شاعر کی زندگی صاف جھلکتی ہوئی نظر آئے گی۔ شیلے ایک جگہ کہتا ہے:

"ہم اپنے آگے پیچھے دیکھتے ہیں اور جو چیز ہمیں نہیں ملتی اس پر کڑھتے ہیں اور افسردہ اور سنجیدہ ہوتے ہیں ہماری سچی سی سچی ہنسی بھی رنج و غم سے معمور ہوتی ہے۔ ہمارے سب سے میٹھے اور رسیلے گیت وہ ہوتے ہیں جن میں سب سے زیادہ رنج و غم کے خیالات کا اظہار ہوتا ہے"۔

فانی کے المیہ نغمے یقیناً دل جلوں کی محفل میں مقبول رہیں گے کیونکہ فانی نے اس میں جذبات و احساسات کی ایسی دلکش تصویر کھینچی ہے جس سے آئے دن ہر انسان کو سابقہ پڑتا ہے۔ میر و درد جس طرح اپنے سوز و گداز کے لئے یاد کئے جائیں گے اسی طرح فانی بھی اپنی قنوطی شاعری سے زندہ رہیں گے اور یاسیت کے امام کہے جائینگے فانی کا غم ان کی زندگی ہے اور ایک پرانا مقولہ ہے کہ احساس رکھنے والوں کے لئے زندگی ایک المیہ ہے۔ میر۔ درد

غالب، حالی اور اقبال ہر شخص اپنے ماحول سے متاثر ہوا ہے، فرق صرف یہ ہے کہ فانی زیادہ قنوطی ہیں - اگر جین آسٹن کو اپنے حلقہ کی عکاسی پر الزام نہیں دیا جا سکتا اور ہارڈی کے فلسفہ کو اگر اپنے حدود کے اندر اہمیت حاصل ہے تو فانی نے ایسا کون سا قصور کیا ہے کہ وہ اس برادری میں جگہ نہ پا سکیں -

فانی بھی غالب کی طرح حساس ہیں، غالب اپنی شوخی اور ظرافت سے سختی اور سستی کو ہوا کر دیتے ہیں لیکن فانی کے یہاں یہی احساس شدت پکڑتا جاتا ہے، کشمیر کے مرغزاروں میں بھی یہی احساس اور انکی وہی نگاہ گہری ہوتی جاتی ہے - فانی نے کشمیر پر جو رباعیاں اور نشاط باغ پر جو نظم کہی ہے اس سے ان کے احساس کی شدت کا ثبوت ملتا ہے - ان کو ہر جگہ وہی تلخی نظر آتی ہے اور اپنے مخصوص انداز میں مصوری کرتے ہیں:

اس باغ میں جو کلی نظر آتی ہے		تصویر فسردگی نظر آتی ہے
کشمیر میں ہر حسین صورت فانی		مٹی میں ملی ہوئی نظر آتی ہے

پھولوں کی نظر نواز رنگت دیکھی		مخلوق کی دلگداز حالت دیکھی
قدرت کا کرشمہ نظر آیا کشمیر		دوزخ میں سموئی ہوئی جنت دیکھی

یہی "دوزخ میں سموئی ہوئی جنت" انکو ہر قدم پر ملتی ہے جس کو وہ ہلکے ہلکے اور دھیمے دھیمے سروں میں اشعار میں تبدیل کر دیتے ہیں اور جسکو ہمارے تنقید نگار رونے اور بسورنے ماتم کرنے اور گریہ و زاری سے تعبیر کرتے ہیں - (باقی)

دی مغل لائن لمیٹڈ

جنگ کے زمانے میں

عدن، جدہ، پورٹ سوڈان مصر اور ماریشس

جانے والے ہمارے مسافر اور مال کے جہازوں کی آمد و رفت ناگزیر حالات کی وجہ سے بے قاعدہ رہی -

قیام امن کے بعد

ہمیں امید ہے کہ حالات عنقریب پہلے کی طرح ہو جائیں گے اور ان بندرگاہوں کو سفر کرنے والوں اور مال بھیجنے والوں کے لئے انشاءاللہ بہت جلد ہمارے جہازات پھر اسی مستعدی اور باقاعدگی سے آنے جانے لگیں گے -

دریافت طلب امور کے لئے:- **ٹرنر ماریسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ**

۱۶- بنک اسٹریٹ بمبئی

گوسالۂ سامری

وَجَاوَزْنَا بِبَنِي إِسْرَائِيلَ الْبَحْرَ فَأَتَوْا عَلَىٰ قَوْمٍ يَعْكُفُونَ عَلَىٰ أَصْنَامٍ لَّهُمْ ۔ (اعراف ۱۶: ۹)

اور بنی اسرائیل کو ہم سمندر کے پار لے گئے تو وہ ایک قوم کے پاس پہونچے جو اپنے چند بتوں کے گرد جمی تھی۔

سمندر پار کرنے سے قبل بنی اسرائیل کا آخری ڈیرا سمندر اور مجدال کے درمیان بعل صفون کے سامنے شتت حیرت میں تھا، سمندر پار کرکے بنی اسرائیل بعل صفون میں نہیں ٹھیرے، تین روز کی راہ طے کرکے ایک عام ارہ میں پہونچے، بعل صفون میں صفون کہلانے والے ایک بعل[۱] کی پوجا ہوتی تھی، صفون کا ماخذ نہیں معلوم کیا ہے، ابن جریر نے ابن جریج سے تخریج کی ہے کہ اس آیت کے اندر مذکور قوم گائے بیل کی مورتیں تانبے کی بناکر پوجتی تھی۔ صفون کو مصری لفظ ساپونت (شہزادہ پونت) سمجھیں تو یہ زریں ملکہ پونت دیبی ہاتھور یعنے بقرہ صفرا کے فرزند ارجمند کی مورت کا نام ہے۔ بعل صفون کے سامنے سے گزرنے کا جو اثر بنی اسرائیل نے لیا اس کو الیصفن بن عزی ایل (عدد ۳: ۳۰) اور الیصفن بن فرناک (عدد ۳۴: ۲۵) کے نام ظاہر کرتے ہیں اس نام کو ایلی صفون (میرا خدا صفون ہے) بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

اگر آپ سرزمین سینا میں جائیں گے تو متعدد تحریریں وہاں ملیں گی جن سے ظاہر ہوگا کہ اس دیار پر فراعنۂ مصر کی حکومت تھی، یہاں ایک قوم منتو بستی تھی، اس قوم کے ایک خاندان نے مصر پر مدتوں حکومت کی، اس خاندان کو گیارھواں خانوادہ کہتے ہیں جس کے اکثر بادشاہ منتوحطب کہلائے، منتوحطب سوم کی ایک تحریر جزیرۃ الکنوز میں قصر انس الوجود کے پاس منقوش ہے جس میں یہ بھی مذکور ہے کہ وہ دیوی لخم کا پجاری تھا۔ یہی نام لخم ہو کر حضرت مسیح کے شہر بیت لحم افراناہ کے نام کا ایک جزبنا۔ کبھی یہاں مصر کی دیوی لخم یا بابل کے دیوتا لخمو کا مندر تھا اس لئے بیت لحم اس کا نام ہوا۔ ایک گروہ کا نام بائبل میں یشوبی لحم ہے جن کو بنی یہوداہ میں شمار کیا گیا ہے، یشوبی لحم کو عربی بنا کے

---

[۱] یہ لفظ ایک خاص وقت میں نرچوپایہ کی بولی سے بنایا گیا۔ بعل (نرچوپایہ) بعال (مباشرت) بعل (شوہر) کے الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں اہل مصر ایک زمانہ میں ہرام کو تصویروں میں قلمبند کرتے تھے، قوت تخلیق کو قوت تولید سے تشبیہ دیکر نرنوم کی تصویر کشی کرتے تھے۔ وہی چیز گوسالہ بنی رفتہ رفتہ ہر معبود کو بعل کہنے لگے۔

تو "یعکفون علیٰ لخم" ہو جائے گا۔ ابن ابی حاتم نے جناب قتادہ سے تخریج کی ہے کہ اس آیت میں جس قوم کا ذکر ہے وہ لخم ہیں اس لخم کو حیرہ کے لخم خیال کر کے مفسروں نے اس قول پر ترجیح نہیں دی، لخم سے مراد قرآن کے ہم عصر بنو لخم نہیں بلکہ وہ لخم پرست لوگ ہیں جن کی روش یشوبی لحم نے اختیار کی تھی۔ بنو اسرائیل جب ان قدیم یشوبی لحم کے پاس پہونچے تو

قالوا یاموسیٰ اجعل لنا الٰہا کما لہم آلہۃ کہا اے موسیٰ جیسے خدا انکے ہیں ویسا ہی خدا ہمارے لئے بھی بنادو۔

خروج ۳۲ : ۱ کے مطابق یہ بات حضرت ہارون سے کہی گئی تھی اور انھوں نے فرمایش پوری بھی کر دی تھی، اس آیت کو خروج کے اس بیان سے ملا کر پڑھنے کے بعد خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ آیت اسی بیان کی اصلاح کے لئے اُتری مگر یہ محض اتفاق ہے۔ خروج ۲۰ : ۱ میں ہارون کا نہیں بلکہ بیت لحم کے مورث اعلیٰ حور بن افراتہ کا نام تھا جسے کاٹ کر ہارون بنا دیا گیا۔ یہ تحریف اتنی قدیم نہیں ہے کہ اسے قرآن کی کسی آیت کا سبب نزول قرار دیا جائے۔

بنی یہوداہ کے ایک خاندان کا نام عیر نحش ہے (ایام ۴ : ۱۲) جس کا لفظی ترجمہ ہے "سانپ کا شہر" بابل کے دیوتاؤں میں ایک دیوتا کا نام حوا ہے، جس کو معلم بشر اور مرشد جہنم مانا جاتا تھا۔ اس کی مورت سانپ کی سی بنائی جاتی تھی۔ یہ درحقیقت وہی پرانا سانپ تھا "جو ابلیس اور شیطان کہلاتا ہے" (مکاشفہ) لیکن حضرت حزقیاہ کے زمانہ (۶۹۶ یا ۷۲۵ قبل مسیح ابراہیم) تک عیر نحش والے اس کے آگے بخور جلاتے تھے۔ حضرت حزقیاہ نے اس کی مورت کو توڑ پھوڑ کر چکنا چور کر دیا۔ سفر ملوک کا مولف لکھتا ہے "اس نے وہ کام کیا جو خدا کی نظر میں بھلا ہے۔"

اس کے باوجود اس کی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ تانبے کا یہ سانپ حضرت موسیٰ نے ان کو بنا دیا تھا (ملوک ۱۸ : ۴) سفر عدد میں اس کی مورت بنا دینے کا حکم خدا کے منھ میں دھرا ہوا ہے (باب ۲۱) وجہ یہ بتائی ہے بنی اسرائیل پر انکے ایک جرم کی بدولت خداوند نے جھلسنے والے سانپ بھیجے یہ لوگ توبہ تلا مچانے لگے تو پیتل کا ایک سانپ موسیٰ نے بنا کر میدان میں نصب کیا، مارگزیدہ جب اس پر نظر کرتا تو اس کا زہر اُتر جاتا تھا۔ اس قسم کی بیہودہ روایتوں کی بنا پر عرب کے وہ اہل کتاب جن کی بابت قرآن میں لکھا ہے کہ "جبت اور طاغوت پر ایمان رکھتے تھے" (النساء ۸ : ۱) اپنی باطل پرستی کی بابت یہ کہا کرتے تھے کہ "اس کا حکم ہم کو اللہ نے دیا ہے" (اعراف ۳ : ۲) ۔ وہ اپنے ہر عمل کو حضرت موسیٰ کے حکم پر مبنی قرار دیتے تھے اسی کی تردید کے لئے یہ آیتیں اُتریں۔

یہ قصہ ہجرت سے بہت پہلے مکہ میں اُتر چکا تھا، ۸ھ میں جب لوگ غزوۂ حُنین سے لوٹ رہے تھے، راہ میں ایک درخت ذات انواط پڑتا تھا۔ ایام جاہلیت میں فتح کی خوشی منانے والے اس درخت میں اپنی تلواریں لٹکا کر اسکے گرد طواف کیا کرتے تھے، کسی نو مسلم نے کہا یا رسول اللہ ایک ذات انواط ہمارے لئے بھی — ! فرمایا سبحان اللہ تم نے بھی وہی کہا جو اصحاب موسیٰ نے کہا تھا کہ ہمارے لئے بھی ایک دیوتا بنا دو جیسے دیوتا ان کے ہیں، پھر جواب

موسیٰ کو دہرایا۔

قال انکم قوم تجھلون - انّ ھٰٓؤلاءِ متبرٌ ماھم فیہ وباطلٌ ما کانو یعملون - (اعراف ۱۶: ۱۰۹)

کہا تم لوگ نادان لوگ ہو، یہ جس ریت پر ہیں وہ غارت ہونے کو ہے اور یہ جو کرنے آئے ہیں وہ باطل ہے

سفر خروج میں ہے کہ یہ لوگ جب سمندر پار کر کے مارہ میں آئے تو خدا نے انکے لئے ایک آئین اور ایک شریعت بنائی اور فرمایا کہ اگر اس آئین اور شریعت پر قایم رہو گے تو مصر کی بیماریوں سے محفوظ رہو گے (خروج ۱۵: ۲۶،۲۵) یہاں آئین و شرع کی تفصیل نہیں، سفر استثناء سے معلوم ہوتا ہے کہ "اور معبودوں کی پیروی اور عبادت کرنے والوں کو دھمکی دی گئی تھی کہ مصر کی بیماریوں سے کبھی نجات نہ پاؤ گے (استثناء ۲۸: ۱۴ و ۲۷) آئین یہ تھا کہ "خدائے واحد کی بندگی کرو جو نہ صرف بے شریک ہے بلکہ بے مورت بھی ہے"۔ یہ آیتیں اسی آئین کا سبب نزول دہراتی ہیں۔ اصل آئین دہرانے کی بجائے سبب کو دہرانے کی وجہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ پر جو بت پرستی کی روا داری کا بہتان لگایا جاتا تھا اس کی تردید ہو، بائبل کے بیان کے مطابق حضرت موسیٰ نے صرف کوڑھ وغیرہ امراض کی دھمکی دیکر بت پرستی سے روکا تھا، قرآن میں ہے کہ موسیٰ نے یہ بھی

قال اغیر اللہ ابغیکم الٰھًا وھو فضلکم علی العٰلمین -

کہا کیا میں اللہ کے غیر کو تمھارے لئے دیوتا قرار دوں؟ اس نے خود تم کو ساری کائنات سے برتر بنایا۔

مارہ سے روانہ ہو کر بنی اسرائیل ایلیم آئے۔ یہیں من وسلویٰ کا واقعہ ہوا۔ ایلیم سے افیدیم آئے، یہاں عمالقہ سے جنگ ہو گئی، یہ قصہ قرآن میں نہیں ہے، یہاں سے اُٹھے تو بیابان سینا میں طور کے پاس پہونچے، یہاں سب سے پہلے صاعقۂ طور والا واقعہ پیش آیا۔ (نساء ۲۲: ۱) کے مطابق یہ قصہ گوسالہ پرستی سے قبل کا ہے، مگر اس کے ذکر کو خدا نے سورۂ اعراف میں دُہرانا اس لئے پسند نہیں کیا کہ مضمون کی یکسانی مقتضی تھی کہ اس تذکرہ کے عین بعد قصۂ گوسالہ کا ذکر ہو، چنانچہ ان آیتوں کے بعد بنی اسرائیل کو مخاطب فرما کر فرعون سے نجات دینے کا احسان جتا کر ارشاد فرمایا (اعراف ۱۷: ۱)

وواعدنا موسیٰ ثلٰثین لیلۃً وّ اتممنٰھا بعشرٍ فتم میقات ربہٖ اربعین لیلۃً -

اور موسیٰ سے ہم نے تیس راتوں (کے اعتکاف) کا عہد لیا پھر دس اور ملا کر اسے مکمل کیا اس طرح اسکے رب کی میقات ۴۰ راتیں پوری ہوئیں۔

ان چالیس راتوں کا ذکر بقرہ میں بھی ہے مگر اس میں ۳۰ اور ۱۰ جدا جدا دو ٹکڑے نہیں کئے گئے۔ فرق کی وجہ یہ ہے کہ آیت بقرہ موحد یہود کے ساتھ بحث کے سلسلے میں اُتری جن کی کتابوں میں میقات کی مدت ۴۰ روز یونہی بے تجزیہ مذکور ہے، سورۂ اعراف ان اہل کتاب کو سمجھانے کے لئے اُتری جو کہ جبت اور طاغوت پرستان

رکھتے تھے اور اپنے دین کو جس کا توراتی نام بے حیائی اور زنا ہے اور قرآنی نام الفاحشہ ہے امرِ خدا قرار دیتے تھے ان کی روایتیں گوسالہ پرستی کی مدت صرف دس روز بتاتی تھیں۔ گوسالہ پرستی کا واقعہ خروج کے بعد ساتویں ماہ پیش آیا جس کے ابتدائی دس ایام بنی اسرائیل کے درمیان وہی اہمیت رکھتے ہیں جو اہمیت مسلمانوں کے یہاں ذیحجہ کے ابتدائی دس ایام کو حاصل ہے۔ یہ ایام عہدِ ابراہیم سے قربانی کے ایام تھے۔ اگر مسلمانوں کے درمیان بھی یہود کی طرح قمری مہینوں اور شمسی برسوں کا حساب جوڑ کر کبیسہ ٹھیک کرنے کا دستور ہوتا تو ہمارا ذیحجہ اور یہود کا چھٹا ماہ جواب پیلاہے ہمیشہ ایک ہوتا، اور دس کے ٹکڑے کرنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ شاید اشارہ یہ بتانا مقصود ہو کہ حضرت موسیٰ کے لوٹنے میں مقررہ مدت سے صرف دس یوم کی دیر ہوئی تھی جو سب سے بڑا فتنہ بن گئی۔

بہر حال حضرت موسیٰ طور پر تشریف لے گئے۔

وقال موسیٰ لاخیہ ہارون اخلفنی فی قومی و اصلح ولا تتبع سبیل المفسدین۔ (اعراف ۱۷:۱)

اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ میری قوم میری نیابت کرنا اور حالت سدھارتے رہنا اور مفسدوں کی راہ اختیار نہ کرنا۔

سفرِ خروج کے بیان کے مطابق حضرت موسیٰ نے حضرت ہارون کے علاوہ ایک اور شخص کو بھی خلیفہ مقرر کیا اور وہ تھا حور بن افراتہ، مفصل بحث اسرائیلی روایات کی تشریح میں آئے گی، یہاں اتنا کہنا کافی ہے۔ قرآن کریم نے ذکرِ خلافت کے وقت اس کا نام حذف کر کے اس بیان کی بھی اصلاح کر دی ہے۔ قدیم مفسروں کے اندازِ بیان کی تقلید کا شوق کہتا ہے کہ ہم کو بھی اس محذوفِ قرآن شخص کا ذکر نہ کرنا چاہئے، لیکن چونکہ اس کے ذمہ لکھا ہوا الزام اب ہارون کے ذمہ لکھ گیا ہے اس لئے تذکرہ ضروری ہوگیا تاکہ شروع ہی سے ناظرین اصل مجرم کی شناخت کے لئے درکار معلومات کو ذہن نشین کرتے جائیں، اس جگہ پر یہ بھی ہم پہلے سے بتا دینا چاہتے ہیں کہ حور بن افراتہ بھی قرآن کا سامری نہیں ہے۔

اس تذکرہ کے بعد قرآن میں کلامِ طور کی تفصیل ہے جسے اسوقت ہم چھوڑتے ہیں کیونکہ بحث ہم کو صرف قصۂ سامری سے ہے، ربطِ آیات کے لئے اس باب کی ایک آیت دہرانا ضروری ہے، خدا نے حضرت موسیٰ کو چند الواح دیں اور فرمایا:۔

وکتبنا فی الالواح من کل شیءٍ موعظۃً و تفصیلاً لکل شیءٍ۔

اور ہم نے لوحوں میں ہر مضمون کی نصیحت اور ہر شے کی تفصیل لکھ دی۔

چند لوحوں میں ہر شے کی تفصیل کیسے آگئی؟ اس سوال کے مفصل جواب کا یہ محل نہیں ہے مختصراً تشفیِ خاطر کے لئے یہ کہنا کافی ہے کہ سماوی اندازِ تحریر میں ایک چھوٹا سا نقش بہت وسیع عبارت کو مشتمل ہوتا تھا۔ قرینہ کہ

ماتھے پر توراۃ کے مطابق صرف ایک "اوت" کو نقش کر دیا گیا تھا جس کا مطلب سفر تکوین کے مولف نے یہ سمجھا کہ "جو قاین کو قتل کرے گا اس سے سات گنا بدلہ لیا جائے گا" (تکوین ۴: ۱۵) احبار تالمود نے اس اوت کا مطلب یہ سمجھا کہ "جس نے ایک کی جان لی اس نے گویا پوری نسل کو مار ڈالا" قرآن نے اسی مطلب کی تصدیق کی ہے۔ حروف مقطعات کی سماتی معانی کی بحث میں ہم نے اس پر مفصل بحث کی ہے۔

حضرت موسیٰ ادھر طور پر گئے ادھر سامری نے لوگوں کو گمراہ کرنا شروع کیا۔

واتخذ قوم موسیٰ من بعدہ من حلیهم عجلاً جسداً لہ خوار۔ (اعراف ۱۸: ۱)	اور موسیٰ کی قوم نے ان کے پیچھے اپنے زیورات سے ایک بچھوا اپنا لیا[1] ایک ڈھانچہ جسکے لئے بولی بھی تھا۔

اس قصے کا ذکر بائبل کے پانچ صحیفوں میں ہے ان میں کسی ایک کے اندر بھی گوسالہ کے بولنے کا ذکر نہیں ہے اس لئے ڈاکٹر ٹسڈل نے نہیں پوچھا لیکن ان کی طرف سے ہم نے قرآن مجید سے پوچھا کہ توراۃ کے بیان پر "جسداً لہ خوار" کے اضافے کا سبب کیا؟ آیت کا آیندہ ٹکڑا بول اُٹھا کہ جبت اور طاغوت پر ایمان رکھنے والے اہل کتاب اس کے بولنے سے اپنے دین کے حق بجانب ہونے پر استدلال کرتے تھے، اس لئے اس بات کے اقرار یا انکار کے بغیر چارہ نہ تھا اور جس حد تک تاریخی واقعے کے مطابق تھی اس حد تک تسلیم کرنا ضرور تھا، اب ہم نے بائبل سے دریافت کیا تو بائبل بولی کہ موسیٰ کے زمانہ سے ہوشیع کے زمانہ تک بنی اسرائیل کے ایک نہ ایک گروہ نے ہمیشہ عجل پرستی کی، جس شان سے حضرت موسیٰ کے زمانے میں تپلا بولا تھا اسی طرح بعد میں بھی بولتا تھا، انبیائے بنی اسرائیل کا اسے "عجلٌ مستکۃٌ" کا نام دینا اس کی پوری حقیقت کو مخاطب کے سامنے حاضر کر دیتا تھا کیونکہ ان کے دنوں ڈھلے ہوئے بچھڑے کا بولنا روز کا معمولی واقعہ تھا، مگر قرآن کے زمانے میں "بولتا پتلا" محض افسانہ بن کے رہ گیا تھا اور اس کے بولنے کی حقیقت لوگوں کو معلوم نہ تھی اور اس لئے وہ اس کے صانع کا اعجاز بن گئی تھی قرآن نے بتایا کہ اس کا بولنا تو جادو تھا نہ اعجاز بلکہ صرف وہ ایک بولتا پتلا تھا جس سے بیل کی سی آواز نکلتی تھی اور وہ بات نہیں کرتا تھا۔

بولتی کٹ پتلیاں بچپن میں ایک دیہاتی مداری کے تماشے میں راقم حروف خود دیکھ چکا ہے۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ یہ صنعت کیا عہد موسیٰ میں بھی اس قدر ترقی پا چکی تھی؟ عہد موسیٰ پر ہم بعد میں بحث کریں گے پہلے بائبل میں عہد موسیٰ کے بہت عرصہ بعد پتلوں کو مشرکوں کے مسائل کا جواب دیتے ہوئے دیکھ لیجئے۔

---

[1] بنا لیا غلط ترجمہ ہے، اتخاذ قرآن میں، جب ایک مفعول کے ساتھ آتا ہے تو اپنانے کے معنے میں آتا ہے۔ جیسے "ما اتخذ اللہ ولداً [illegible] بیٹا" دو مفعول کے ساتھ آتا ہے تو ایک کو دوسرا قرار دینے کے معنے میں آتا ہے جیسے "اتخذوہ مفرداً"

قاضیوں کے زمانہ میں ایک مشرک کاہن تھا، ہارونؑ علیہ السلام کو جن لوگوں نے حور بن افراتہ کی جگہ میں رکھدیا ہے ان کے چہروں کی نقاب کشائی کے وقت ہم اس کاہن کا مفصل ذکر کریں گے، اس کاہن سے بنودان نے کہا: "ذرا خدا سے پوچھ لو کہ ہمارا سفر مبارک ہوگا یا نہیں" (قضاۃ ۱۸: ۵)

حضرت الیاس کے معاصر شاہ اسرائیل اخی آب کے بیٹے آخزنے "قاصدوں کو بھیجا کہ جاکر عقرون کے دیوتا بعل زبوب (مکھیوں کے مالک) سے پوچھو کہ میں اچھا ہوں گا یا نہیں" (۲ ملوک ۱: ۲)

ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بتوں سے مشورے کرنے کا عام رواج تھا، ان کے بت ان سوالات کا جواب بھی دیتے تھے، سفر ہوشیع میں ہے۔

عَمّی بِعِصُو یِشْآلْ وِمَقْلو یَجِّیدْ لو کِی رُوحَ
زْنُونِیم ہِتعَہ وِیِذْنُو مِتَّحَت اِلوہیم۔
(ہوشیع ۴: ۱۲)

میری قوم اپنے کاٹھ سے فتویٰ پوچھتی ہے اور اسکی لکڑی اسے جواب دیتی ہے کیونکہ بدمذہبی کی روح نے انکو گمراہ کردیا ہے، اور وہ اپنے دیوتا کے ماتحت بدکار ہوگئی ہے۔

بائبل میں جہاں کہیں زنا کا لفظ آیا ہے اس کو ترجمے میں برقرار رکھکر مترجموں نے مطلب بدلدیا ہے، عبرانی میں سب بدکاری یہاں تک کہ جھوٹ بولنا بھی زنا ہے۔

جس لفظ کا ترجمہ لکڑی یا لٹھ کیا جاتا ہے وہ مقل ہے، عربی میں ایک درخت کا نام ہے دوم، اس کے پھل کو عربی میں مقل کہتے ہیں، اسی درخت کی لکڑی سے بولتی پتلی بناکر اسے سونے یا چاندی سے مڑھ دیا جاتا تھا، اسی کو مقل کہا جاتا تھا۔ بولتے پتلے کا دوسرا نام ترافیم بھی تھا، ترافیم خالص سونے یا چاندی کے ڈھلے ہوئے پتلے ہوتے تھے اور یہ بھی مقل کی طرح آواز دیتے تھے، چنانچہ سفر زکریا میں ہے:۔

ہَتِّرافیم دِبِّرُو آوِن (۱۰: ۲) — ترافیم نے باطل باتیں کہی ہیں۔

یہ بت محض پیش گوئیاں نہیں کرتے تھے، بلکہ مشرکین ان سے فتوے بھی پوچھتے تھے، اسی لئے ان بتوں کو "باطل کے معلم" بھی کہا جاتا تھا، چنانچہ حضرت حبقوق فرماتے ہیں:

مَہ ہُوعِیل فِیسِل ؟ کی فِسلُو
یُصرُو۔
وُمُورِہ شِقِر کی بَطَح یُصیر یُصرُو عَلاَ
یُو لَعَشُوت اِلِیلیم اِلّمیم ہوی اُومِر

فایدہ کیا ہے ؟ گھڑی ہوئی مورت سے جسکی اس کے بنانے والے نے صورت گری کی ہے۔ اور باطل کے معلم سے جس پر اس کی صورت کا مصور بھروسہ کرتا ہے بے جان بتوں کو بنانے کے لئے۔

---

۱ نشان (ے) اوپر ضمہ مجہول، نیچے کسرہ مجہول ۱۲

لِعلِصْ ہِفِیصَہ - عوْرِیْ لابنُ دوُھم ہوا
یوُرِے ؟
ہِنے ہوا تَفُوشْ زھبَ وِکِیفْ وَکُل رُوح
اَیِنْ بقِرْبُو - (حبقوق ۲: ۱۸ و ۱۹)

افسوس ہے اس پر جو کاٹھ سے کہتا ہے اُٹھ! اور
بے حرکت پتھر سے کہ جاگ، کیا وہ تعلیم دے سکتا ہے؟
دیکھو وہ تو سونے اور چاندی کے خول میں ہے اور
اس کے اندر کچھ بھی جان نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بتوں کو جن کے اندر جان تک نہیں تھی، مشرکین اپنے دین کا معلم قرار دیتے تھے، ان سے مسئلے پوچھتے تھے، جواب لیتے تھے، لیکن اس جواب کی نوعیت کیا ہوتی تھی؟ یہی بات بائبل میں مذکور نہیں ہے۔ ہوشیع، ذکریاہ اور حبقوق کے معاصرین خوب جانتے تھے کہ بت محض آواز دیتا تھا، بات نہیں کرتا تھا، قرآن کے زمانہ میں قدیم بتوں کے جوابات محض روایات تھے، اور ان روایات سے استدلال کیا جاتا تھا اس لئے خدا نے (جسداً لہ خوار) کہکر بولنے کی حقیقت بتائی اور مزید تشریح کے لئے آگے یہ بھی فرمایا:-

اولم یروا انہ لایکلمھم ولا یھدیھم سبیلا
(اعراف ۱۸:۱)

کیا ان لوگوں نے (بعد میں) دیکھ نہیں لیا کہ وہ انسے
بات نہیں کرسکتا تھا اور ان کو راہ نہیں بتاتا تھا۔

بولتے پتلے محض آواز دیتے تھے اور کاہن ان آوازوں کے اُتار چڑھاؤ کا مطلب بیان کرتے تھے۔ یہ تھی بچھوے کی بولنے کی حقیقت۔

اب رہا یہ سوال کہ عہد موسیٰ میں بت بولتے تھے یا نہیں؟ قرآن کے بیان کے بعد ہمیں مزید تاریخی ثبوت کی ضرورت نہیں، جن کو اب بھی ضرورت ہے آیندہ اکتشافات کا انتظار کریں۔

قرآن مجید میں جس شخص کا ذکر ہامان کے لقب سے آیا ہے، شہر کرنک میں اس دو مجسموں کے ٹکڑے، آج بھی موجود ہیں جن کو شامہ اور طامہ کہا جاتا ہے، ان میں سے ایک کی بابت یونان و روما کے متعدد سیاحوں نے لکھا ہے کہ انھوں نے اشراق کے اوقات میں اس بُت کو گاتے سُنا ہے، چونکہ یہ تمام سیاح پہلی صدی عیسوی کے تھے اور ۲۷ سنہ ق م میں زلزلہ آیا تھا جس سے یہ بُت ٹوٹ گیا تھا اس لئے اس مغنی بت کے گانے کو عموماً مورخوں نے زلزلہ سے پیدا ہونے والے شگاف اور صبح کی شبنم اور آفتاب کی حرارت کا مخلوط اثر بتایا ہے، اس واقعے کا ذکر مصر قدیم کی کسی تاریخ میں آپ دیکھ سکتے ہیں۔

مصری تحریروں میں بھی دیوتاؤں سے سوال و جواب کا ذکر ہے راقم حروف خود کو اس سے زیادہ تشریح کا اہل نہیں سمجھتا۔

عام طور پر یہ کہانی مشہور ہے کہ گوسالہ میں جان پڑ گئی تھی، ڈاکٹر ٹسڈال نے قصۂ گوسالہ کا مذاق اُڑانے کیلئے اس کہانی کو نقل کرکے اسے قرآن کا مطلب قرار دیا ہے۔

پہلے سورہ طٰہٰ کی ایک آیت نقل کی اس کے بعد جلالین کے حوالے سے اس کے گوشت پوست اور روح کا ذکر کیا اس نے فرمایا "یہ روایت بھی یہود سے لی گئی ہے" پھر ربّی ایل یعزر کے حوالے سے ربّی یہوداہ کا ایک مقولہ نقل کیا جس میں گوسالہ کے بولنے کی ایک توجیہ مذکور ہے مگر نہ گوشت ہے نہ پوست، نہ ہڈی ہے نہ جان، مگر دعویٰ فرما دیا کہ:

"یہ خیال کہ وہ گوسالہ بولتا تھا اس مفروضہ سے پیدا ہوا کہ وہ زندہ تھا"

سوال یہ ہے کہ یہ مفروضہ کس کا ہے ؟

کیا ربّی ایل یعزر کا ——————؟ ہرگز نہیں اس کا قول مفروضے کا متحمل نہیں !

تو کیا ربّی یہوداہ کا ——————؟ " " " "

تو کیا قرآن کا ——————؟ " " " "

تو کیا صاحب جلالین کا ——————؟ جی نہیں ان کا بھی نہیں کیونکہ ان کی بابت تو ارشاد گرامی یہ ہوا ہے کہ "صاحب جلالین نے گوشت اور خون سے گوسالہ کا بنا ہونا اس لئے ظاہر کیا ہے کہ وہ بولتا تھا اور سونے کے بنے ہوئے گوسالہ کا بولنا ان کے نزدیک خلاف عقل تھا"، اس ارشاد نے فیصلہ کر دیا کہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک (۱) قرآن کا گوسالہ بولا — (۲) اس بولنے کی وجہ سے صاحب جلالین نے اس میں جان ڈالی۔

تو سوچ کر بتایئے کہ اس کے جاندار ہونے کا مفروضہ جو کہ بولنے کی روایت کا باعث یا بازاری لفظوں میں باپ ہے، اپنے باپ کا باپ کیسے ہو گیا۔ آپ کو جواب نہ سوجھے تو ہم سے پوچھئے جس شخص کے نزدیک "وہ زندہ تھا اسلئے کہ وہ آگ سے نکلا تھا"، جس شخص کا دماغ ایسا مفروضہ گھڑ سکتا ہے اس کے نزدیک خیال ء کا بیٹا اور باپ دونوں ہو سکتا ہے، اس مفروضے کو وہی دماغ اپنے اندر جگہ دے سکتا ہے جس کا علم ناموس فطرت کے متعلق اتنا وسیع ہے کہ وہ خوف تردید کے بغیر دعویٰ کر سکتا ہے کہ جو چیز آگ سے نکلتی ہے وہ جاندار ہوتی ہے۔

صاحب جلالین نے جس وجہ سے اس کے اندر جان ڈالی وہ یہ نہیں ہے کہ ان کے نزدیک پتلے کا بولنا اس کے اندر جان پڑے بغیر ناممکن تھا بلکہ وہ چند روایتوں کی بنا پر مجبور پڑے، ان روایتوں کے علاوہ علمِ لغت کی وسعت نے بھی ان کو دھوکہ دیا۔

(۱) جسّ ۔ کے نے ہیں ٹٹولنے کے، عمل کا تصور کرو ایک جسم دوسرے جسم سے ملا، اس کی حس کو زے بدلدو جزّ، جزّ کے معنے ہیں کاٹنا، ایک جسم دوسرے جسم سے کٹ کر علٰحدہ ہوا۔

(۲) جزم = کاٹنا، جسم = مجموعۂ اعضا، ہر وہ چیز جو چھوئی جا سکے۔

(۳) جسر = پل، دریا کے دو جدا کئے ہوئے ٹکڑوں کو متصل کرتا ہے۔

(۴) اسی طرح جسد کے معنے بھی ایک شے سے دوسری شے کا متصل ہوتا تھا، کثرت استعمال نے انصاب سے قربانی کے لہو کے چپکنے کے لئے اس لفظ کو خاص کیا جس سے جسِد (بکسر سین) کا لفظ بنا، ایک شاعر نے کہا:۔

فلا لعمر الذی مسحت کعبتہ وما اریق علی الانصاب من جسِدِ

(ترجمہ) "نہیں ایسا نہیں ہے، قسم ہے اس ذات کی جس کے کعبہ کو میں نے چھوا اور قسم ہے اس خون کی جسے انصاب پر بہایا کرتا ہوں"۔

جسِد کا مقابل جسَد (بفتح سین) کا لفظ ہے، ابتدا میں یہ نام صرف اس مقدس پتھر کا تھا جس پر قربانی کا لہو بہایا جاتا تھا، پھر ایسے جسم کو کہنے لگے جو لہو میں لتھڑا ہوا ہو، طرق استعمال کے روزانہ تغیرات نے اس لفظ میں حسب ذیل ترتیب سے متعدد معانی پیدا کئے۔

(۱) خون سے لتھڑا ہوا — (۲) گوشت اور خون — (۳) جانور کا بدن گوشت اور خون کا بنا ہوا۔ (۴) جانور کا سا بدن — (۵) جسم بے جان — (۶) بے جان سا لاشہ۔

قرآن کریم میں لفظ جسد چار بار آیا ہے، دو بار تو اسی قصے میں ہے، سورۂ انبیاء میں پیغمبروں کی بابت فرمایا "ہم نے ان کو جسد نہیں بنایا تھا کہ وہ کھانا نہ کھاتے اور نہ وہ ہمیشہ جیتے رہنے والے تھے (۱: ۸) یہاں صریحاً "جسد" کے معنے "بے جان" کے ہیں۔ سورۂ صاد میں حضرت سلیمان کے بے جان کی طرح گر پڑنے کا ذکر خدا نے یوں کہا ہے کہ "ہم نے ان کی کرسی پر ایک جسد کو ڈال دیا" (۳: ۸) یہاں بے جان سے لاشے کا ذکر ہے۔

قصۂ گوسالہ میں جسد کا مطلب درحقیقت وہ چیز ہے جس پر قربانی کا خون چھڑکا جاتا تھا، لیکن جسد کا لفظ اپنے قدیم مذہبی مفہوم کو مسلمانوں کے زمانہ میں بالکل گم کر چکا تھا اس لئے اس کے اس مفہوم کی طرف مفسرین کی توجہ مبذول نہ ہو سکی، "جسم بے جان" کا محل بعض کی سمجھ میں آیا مگر دشواری یہ ہوئی کہ جناب قتادہ سے یہ روایت پہونچی کہ انھوں نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا تھا کہ:

"من حلیھم (استعاروا حلیاً من آل فرعون، فجمعہ، السامری فصلغ منہ) عجلاً (مجعلہ اللہ) جسداً (لحماً و دماً) لہٗ خوار"

(ترجمہ) "اپنے زیوروں سے (+ + وہ آل فرعون سے زیور عاریت مانگ لائے تھے، سامری نے جمع کیا، پھر اس نے اسے ڈھال کر بنایا) ایک بچھڑا (تب اللہ نے اسے بنا دیا) ایک جسد (گوشت اور خون کا) جس کے لئے ڈکارنا تھا"

ترجمہ میں جہاں ہم نے دو چلیپائیں رکھی ہیں ہمارے خیال میں وہاں سے یقیناً ایک ایسی عبارت ساقط ہے جس کا مطلب یہ تھا کہ "برخلاف اس کے یہود کہتے ہیں، اسی سقوط نے غلط فہمی پیدا کی، اس مضمون کو ہم نے

اس لئے ساقط سمجھا کہ پہلے "بین اللفظین" میں جو تین باتیں کہی گئی ہیں تینوں قرآن مجید کے مسترد کئے ہوئے اجزا ہیں۔

(۱) سامری نے ڈھال کر بنایا مطابق ہے (خروج ۳۲: ۴) کے، لیکن مخالف ہے (طٰہٰ ۴: ۱۲) کے، جہاں یہ مذکور ہے کہ سامری نے اوزارِ قوم میں سے نکالا۔

(۲) سامری نے زیورات جمع کئے مطابق ہے (خروج ۳۲: ۴) کے، لیکن مخالف ہے (طٰہٰ ۴: ۱۱) کے۔

(۳) خدا نے کہا اپنے زیوروں سے، روایت بولی آلِ فرعون کے زیوروں سے یہ روایت مطابق ہے (خروج ۳: ۲۱ و ۲۲ و ۱۲: ۳۶) کے، خروج کے اسی بیان کی بنیاد پر مدینے کے مفتیانِ یہود کہتے تھے کہ "امیوں (بے کتابوں) کی بابت ہم سے باز پرس کی کوئی سبیل نہیں" (عمران ۸: ۴) اس قول کو نقل فرما کر خدا نے نہ صرف ان کی اس بات کو بلکہ سند میں سُنا کر جسے وہ کتاب اللہ بتاتے تھے اسے بھی کذب و افترا قرار دیا، (عمران ۸: ۶) جناب قتادہ قرآن مجید کی رد کی ہوئی ان خبروں کا ذکر ہرگز تفسیر کے طور پر نہیں کر سکتے تھے۔

دوسرے بین اللفظین میں جو یہ لکھا ہے کہ "تب اللہ نے اسے بنا دیا" یہ جناب قتادہ کا قول نہیں ہے۔

تیسرے بین اللفظین کو لفظ جسد کے معنی عے کے مطابق غلطی سے لحم ودم پڑھنے کی وجہ سے یہ جملہ بعد کے راویوں نے اس لئے بڑھا دیا کہ سامری کی قدرت سے یہ ناممکن تھا۔

اصل یہ ہے کہ قائل اول نے لحماً دُمّاً کہا ہوگا، اعراف ۱۶: ۹ کے ماتحت ہم دیکھ آئے ہیں کہ گوسالہ پرستی پر جس قوم کی ریس نے بنی اسرائیل کو آمادہ کیا وہ یشوبی لحم یعنے لَحم کی پرستار تھی۔ جس چیز کو توراۃ اور قرآن نے توہین کے طور پر عِجل کہا ہے وہی چیز اس کے پرستاروں کی زبان میں لَحم یا لَحم تھی۔ دوم کا لفظ دوم کی صورت میں حبقوق کے اندر ہم پڑھ آئے ہیں جس کا ترجمہ ہم نے "بے حرکت" کیا ہے، بائبل کے مترجمین نے اسکا ترجمہ "Dumb" کیا ہے اور اس انگریزی سے اُردو ترجمہ کیا گیا "گونگا"۔ دوم کے معنے اصل میں حرکت نہ کر سکنے کے ہیں، چنانچہ حضرت یوشع نے سورج سے کہا دُوم (ٹھہر جا) وَیِدّوم شمش (اور سورج تھم گیا) (یشوع ۱۰: ۱۳)۔ لحماً دوماً ایسے ایسے یہودی کے قول سے ماخوذ ہے جس کی زبان پر عربی الفاظ عبرانی مطالب کے حامل تھے مطلب اس کا تھا بے جان بت، مگر عربی میں لحماً دوماً ایک بے معنی لفظ تھا، اس لئے اسے لحماً دمّاً سمجھ لیا گیا کیونکہ جسد کا ایک مفہوم یہ بھی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ قائلِ اول نے لَحم دوم (دوم کا بنا ہوا لحم) کہا ہو اس صورت میں یہ لفظ "جسد الہٰ خوار" کی ٹھیک تفسیر ہو یشیع کے لفظ مُقّل کا ٹھیک ٹھیک عربی ترجمہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اصل روایت میں یہ لفظ ہوتا تو غلط فہمی کا امکان نہ تھا۔

بہرحال قرآن مجید کی بولی میں "جسد" "بے جان" یا "بے جان جیسے" جسم کا نام ہے، گوسالہ کا زیوروں سے بنا ہونا اس مفہوم کی ترجیح کا واضح ترین موجب ہے۔

جن لوگوں کی فہمائش کے لئے سورۂ اعراف اُتری چونکہ ان کی اپنے دین کی حقانیت پر ایک دلیل یہی تھی کہ ہم نے اپنے آبا کو اس روش پر پایا اس لئے یہ بتانے کے بعد تمھارے آبا صرف ایک پتلے کے بول اُٹھنے سے دھوکے میں آگئے تھے مگر بعد میں انھوں نے دیکھ لیا کہ وہ بات نہیں کر سکتا تھا اور اس لئے ہادی نہیں تھا۔ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ:-

اتخذوہ وہم ظالمون ۔ ولما سقط فی ایدیہم ورا وا انہم قد ضلوا قالوا لئن لم یرحمنا ربنا ویغفر لنا لنکونن من الخاسرین ۔

ان لوگوں نے اسے اپنایا تو وہ ظالم تھے اور جب انکے ہاتھوں (ندامت کی کلکلاہٹ) پڑی اور انھوں نے محسوس کر لیا کہ وہ بہک گئے ہیں کہنے لگے اگر ہمیں ہمارا رب معاف نہ کرے اور ہم پر رحم نہ فرمائے تو ہم گھاٹے میں ہونگے

اس طرح گویا یہ بتایا کہ تمھارے اسلاف کے رد یہ میں قابلِ تقلید بات یہ اعترافِ گناہ اور توبہ ہے، قرآن اگر قصاص کی کتاب ہوتا تو اس ندامت و توبہ کا ذکر ابھی نہ ہوتا۔

سورۂ اعراف میں خدا نے تقریباً پورا قصۂ گوسالہ بتایا لیکن یہ نہیں بتایا کہ موسیٰ اور ہارون کے علاوہ اصحابِ موسیٰ کا تیسرا مرشد کون تھا۔ سورۂ طٰہٰ کے ایام نزول میں بعض لوگوں نے کچھ تکلیف دہ باتیں کہیں، تو جس طرح زوجۂ اوریا کے قصہ کی بنا پر سورۂ صاد میں خدا نے فرمایا کہ ان باتوں پر صبر کرو اور داؤد کا ٹھیک ٹھیک حال سنا دو اسی طرح سورۂ طٰہٰ میں فرمایا کہ قرآن اس لئے نہیں اُترا ہے کہ تم دُکھ اُٹھاؤ، اس کے بعد موسیٰ اور آدم کا حال دہرا کر صبر کی تاکید فرمائی، قصۂ موسیٰ کے دوران میں اصحاب موسیٰ کے تیسرے مرشد کا ذکر اس طرح سے فرمایا کہ پہلے من وسلویٰ کا احسان جتایا پھر نہایت مختصر ذکر میقاتِ موسیٰ کا کیا جس میں ان سے حسب ذیل مکالمہ ہوا تھا، خدا نے فرمایا:

وما اعجلک من قومک یا موسیٰ قال ہم اولاء علیٰ اثری وعجلت الیک رب لترضیٰ قال ان قد فتنا قومک من بعدک و اضلہم السامری فرجع موسیٰ الیٰ قومہ غضبان آسفا۔

موسیٰ! تم اپنی قوم کے پاس سے جلد کیوں آگئے" جواب دیا کہ وہ تو میرے نقشِ قدم پر ہیں، تیرے پاس جلد آگیا تاکہ تو راضی ہو، فرمایا مگر واقعہ یہ ہوا کہ تمھارے بعد ہم نے تمھاری قوم (کے ایمان) کو آزمایا اور ان کو سامری نے بہکا دیا، موسیٰ غضبناک ہو کر کڑھتے ہوئے اپنی قوم کے پاس لوٹے۔

ابوالجلال ندوی

ایک سوال

تاریخی بنیاد پر ایک تخئیلی افسانہ

جناب جمیل مظہری اس طبقۂ مخصوص کے انشاپرداز ہیں، جن کو جاننے والے اگر جانتے ہیں تو جانیں لیکن اگر کوئی نہ جانے، تو انھیں نہ اس کی فکر ہوتی، نہ کوئی کاوش۔

جناب جمیل مظہری، کا وطن ثانی کلکتہ ہے، لیکن شاید وطن اول سے زیادہ عزیز، اس لئے شمالی مغربی ہند اُن سے کم مستفید ہوتا ہے۔

وہ نہایت خوش گو شاعر، اور خوش فکر ادیب ہیں اور خیال کی رعنائی، اسلوب بیان کی گیرائی ان کے افکار نثر و نظم کی خصوصیت خاصہ ہے، جو ان کے اس مقالہ میں بھی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔

اس مضمون میں انھوں نے اپنے مخصوص انداز کے ساتھ مزدک کی تعلیمات کو پیش کیا ہے، جو کچھ زمانہ تک ایران کی سرزمین میں "قدر اول" کی چیز سمجھی جاتی تھی۔ اس لئے اگر بعض باتیں ہمارے موجودہ نظام اخلاق و تمدن کے خلاف نظر آئیں، تو انھیں صرف تاریخی حیثیت سے دیکھئے یا اس حقیقت کو سامنے رکھ کر کہ دنیا کے سنوارنے والوں نے اسے کس کس طرح سنوارنے کی کوشش کی، لیکن اس کی "شہر آشوبیاں" بدستور قایم رہیں اور آج بھی جبکہ انسان بہت زیادہ ترقی یافتہ اور مہذب و شایستہ ہوگیا ہے، یہ معمہ بدستور لاینحل چلا آرہا ہے کہ "بندہ و خداوند" کے تعلق کا وہ کونسا پہلو ایسا ہے، جو تکوین اور حاصلِ تکوین دونوں میں صلح و آشتی پیدا کرسکتا ہے۔

مزدک، زردشت کے دو صدی بعد پیدا ہوا اور زردشت ہی کی تعلیم کو اس نے ایک خاص پرجوش انداز میں پیش کیا لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ زردشت کے پوجاری تو بہت ہیں، لیکن مزدک کو کوئی نہیں پوچھتا شکر ہے کہ اس کمی کو جناب جمیل مظہری نے پورا کیا، لیکن خدارا کہیں یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ وہ تعلیمات مزدک کے عامل بھی ہیں۔ دنیا میں بہت سی باتیں ایسی ہیں، جن کے کہنے ہی میں زیادہ لطف آتا ہے، کرنے میں نہیں — ! (نیاز)

"اے رونے والو! میرے ساتھ آؤ — میں تمھارے لئے ہنسی لایا ہوں"۔ — کرۂ ارض

کے اس ماتم خانے میں ایک آواز ایسی بھی اُٹھی تھی ـــ ایران کی اُس سرزمین سے جو فلسطین کی خاک کی طرح پیغمبر خیز تو نہ تھی، لیکن اس سے زیادہ رومان خیز ضرور تھی ـــ آواز لگانے والا ایک درویش تھا۔ اسکے سینے میں کس کی آواز تھی۔ اس کی جستجو کی ضرورت نہیں ـــ وہ اگر یونان کی خاک سے اُٹھتا تو دنیا کو اس جیسی ایک دوسرا افلاطون مل جاتا۔ اور اگر اس نے ہندوستان میں جنم لیا ہوتا تو شاید وشنو تیسرا اوتار مانا جاتا لیکن وہ اُگا ایسی مٹی سے جس میں شہنشاہیت کا تخم پہلے بارآور ہو چکا تھا ـــ اُس نے آنکھیں کھولیں غلاموں کی ایک ایسی بستی میں جہاں زندگی زنجیروں میں جکڑی ہوئی کراہ رہی تھی اور ـــ موت کا فاتحانہ قہقہہ فضا میں بلند ہو رہا تھا ـــ اس نے زندگی کی کراہ سُنی اور موت کے خلاف جہاد کا عزم لئے ہوئے اپنی لاٹھی کے سہارے اُٹھ کھڑا ہوا ـــ یہی وہ لاٹھی تھی جو آگے چل کر عصائے سلطنت بن گئی ـــ شہنشاہی جس کے اشارے پر چلی اور سپہ گری نے جس کے سامنے اپنے ہتھیار کھول کر رکھدئے۔

(۲)

وہ گوتم بودھ کی طرح آلام انسانی کا بھید معلوم کرنے کے لئے اپنے جھونپڑے سے باہر نکلا تھا۔ تجربے نے اسے سمجھایا کہ یہ نتیجہ ہیں ان ناآسودہ خواہشوں کا جو حالات کے تحت پوری نہیں ہوتیں ـــ [illegible] خواہشوں کو پورا ہونا چاہئے کیونکہ خواہشیں فطرت کی آوازیں ہیں اور فطرت سے جنگ [illegible] اس نے سوچا "عافیت خواہشوں کو مار ڈالنے میں ہے" اُس نے سوچا کہ یہ نظریہ انسان کے احساس مجبوری کی پیداوار ہے اور فطرت اس کو مجبور نہیں مختار بنا رہی ہے۔ اگر خواہشوں کو مسلسل روکتے رہنے سے اس کا ارادہ اور اس کے ساتھ اس کی انانیت ضعیف ہوتی گئی تو فطرت کا یہ منشا کبھی پورا نہیں ہو سکتا ـــ یہیں سے اس کا خطِ فکر گوتم کے خطِ فکر سے الگ ہوتا گیا، یہاں تک کہ اس نے تمدن کا ایک ایسا نظام قائم کرنے کا فیصلہ کیا جس کے تحت انسان کی ہر خواہش پوری ہو جایا کرے ـــ جس میں ہر سرمایہ مشترک ہو اور اس مشترکہ سرمائے میں ہر شخص کا حصّہ اس کی ضرورت کے مطابق ہو ـــ اس سے کئی صدی پہلے ارسطو کی شاگردانہ بغاوت کے ہاتھوں افلاطون کے جمہوری تصور کا جو حشر ہوا تھا وہ اس کے سامنے تھا یا نہیں یہ نہیں معلوم لیکن اس نے جو کچھ کرنا چاہا اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ فطرتِ انسانی میں "حبِّ اختصاص" کی موجودگی کا قائل نہ تھا۔ فکر اس کی صحیح تھی یا ارسطو کی، راستہ اس کا ٹھیک تھا یا گوتم کا ـــ گزری ہوئی چودہ صدیاں اس کا فیصلہ نہ کر سکیں، شاید آنے والا زمانہ اس کے متعلق کوئی قطعی رائے دے سکے۔

(۳)

"اے رونے والو! میرے قریب آؤ۔ میں آنسوؤں کے اِس جزیرے میں ہنسی کے پھول کھلانے آیا

ہوں لیکن جس کھیت میں آنسو بوئے جارہے ہیں۔ اُس میں ہنسی کیسے اُگ سکتی ہے! --- اے رونے والو اپنا رونا بند کرو --- مقدس آگ تمہارے آنسوؤں سے ٹھنڈی ہوتی جارہی ہے۔ میں اسے روشن رکھنا چاہتا ہوں لیکن جہاں چولھے سرد ہوں وہاں آتشکدے کیسے روشن رہ سکتے ہیں۔ یہ تھی اس کی آواز جو بگولے کی طرح اس کے سینے سے اُٹھی اور آندھی کی طرح دیکھتے دیکھتے سارے ملک پر چھاگئی --- اُسے خدا نے بھیجا تھا یا زمین والوں کی چیخ سنکر وہ خود آسمان سے نیچے اُتر آیا تھا یہ معلوم نہیں۔ معلوم ہے تو صرف اتنا کہ اس کی اُنگلی کا ایک اشارہ دلوں کے بند دروازے کھول دیتا اور اس کے ہونٹوں کی ایک جنبش عقاید کے سنگین سے سنگین طلسم کو توڑ دینے کے لئے کافی ہوتی۔ اُس نے اپنے محلّہ کے بنئے سے کہا "بنئے ترازو پھینکدے۔ پانی نہیں تولا جاتا تو غلّہ کیوں تولا جائے۔ پانی نہیں بیچا جاتا تو غلّہ کیوں بیچا جائے" اُس نے ترازو پھینکدی اور اس کے ساتھ ہولیا۔

ایک سپاہی سے اس کی ملاقات ہوئی جس کی جوانی زرہ کے حلقوں میں شجاعت کی انگڑائی لے رہی تھی اس نے اس کے کاندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا "بیٹے یہ تیری کمر میں کیا ہے۔ اسے کھول کر پھینکدے۔ تو اس سے موت کی خدمت کرتا ہے اور کرنی چاہئے تجھے زندگی کی خدمت" اس نے تلوار پھینکدی اور اس کے ساتھ ہولیا --- عدالت میں اس کا گزر ہوا جہاں قاضی انصاف کی مسند پر بیٹھا ایک چور کو جس نے نانبائی کی دکان سے ایک روٹی چرائی تھی چوری کی سزا دے رہا تھا۔ اس نے قاضی سے پوچھا "تو روٹیاں کیوں نہیں چراتا؟" قاضی نے بے ساختہ جواب دیا "مجھے روٹیاں چرانے کی کیا ضرورت ہے"۔ "تو پھر جسے ضرورت تھی اُسے سزا کے بدلے روٹی ملنی چاہئے"۔ اس نے قاضی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا --- قاضی مسند سے اور چور ملزم کے کٹہرے سے اُترا اور دونوں اس کے ساتھ ہولئے۔

وہ معبد میں پہونچا جہاں ایک بوڑھا پُجاری سجدے میں جھکا ہوا خدا کی حمد گا رہا تھا۔ اُس نے اسکی پیٹھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "میرے بوڑھے دوست! سجدے سے سر اُٹھاؤ۔ خدا بادشاہوں کی طرح خوشامد پسند نہیں ہے"۔ پجاری نے اس کا ہنستا ہوا چہرہ دیکھا اور معبد میں قفل ڈال کر اسکے ساتھ ہولیا۔

دیر کے صحن میں مقدس آگ کے پُجاریوں کا ہجوم تھا۔ آتشکدہ سلگ رہا تھا اور موبد زایردں کے گروہ سے نذرانے لیکر اس میں ایندھن ڈالتے جارہے تھے۔ اس نے ہاتھ اُٹھا کر کہا "ان لکڑیوں کی ضرورت اس آتشکدے سے زیادہ اُن چولھوں کو ہے جو افلاس کی وجہ سے سرد ہورہے ہیں" زایردں نے موبدوں کو اور موبدوں نے زایردں کو دیکھا اور لکڑیاں پیٹھ پر لاد کر اس کے ساتھ ہولئے۔

(۳)

نسل انسانی کا یہ چرواہا آدمیوں کی بھیڑ لئے ایک دن شاہی محل کے پھاٹک پر پہونچا۔ پھاٹک بند تھا۔ اسنے کہا "پھاٹک کھول دو۔ پہرہ داروں نے گردنیں جھکالیں۔ تلواروں نے سلامی دی اور وہ آگے بڑھتا ہوا بادشاہ کے حجرۂ خاص تک پہونچ گیا جہاں بادشاہ اپنی ملکہ کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھا تھا۔ اس نے پہلا لقمہ اٹھایا ہی تھا کہ آواز آئی "کیقباد لقمہ اٹھانے سے پہلے ہمیشہ یہ دیکھ لے کہ تیری اس وسیع سلطنت میں کوئی خدا کا بندہ بھوکا تو نہیں ہے۔ میرے بیٹے شہنشاہی یزدانی کا دوسرا نام ہے" بادشاہ نے لقمہ ہاتھ سے رکھدیا اور کھڑا ہو گیا۔ "مقدس باپ کے پاس اپنے گنہگار بیٹے کے لئے کیا حکم ہے؟"

— "حکم! تو بادشاہ ہے حکم دینا تیرا کام ہے اور میں فقیر ہوں ہاتھ پھیلانا میری عادت ہے (ہاتھ پھیلاتے ہوئے) دے اگر دے سکتا ہو؟"

— مقدس باپ کو کیا چاہئے؟

— رونے والوں کے لئے تھوڑی سی ہنسی!

— یہ چیزیں تجھے کیونکر دے سکتا ہوں؟

— ہانڈیاں خالی ہیں ان میں اناج بھر کے۔ چولھے سرد ہیں ان میں ایندھن ڈال کر۔ چراغ بجھے ہیں ان کو تیل دیکر۔ چھاتیاں سوکھی ہیں ان میں دودھ پیدا کر کے۔

— مگر مقدس باپ میری سلطنت میں ایسا کیوں ہو رہا ہے؟

— اس لئے کہ تیری سلطنت میں ایک مٹھی اناج کی قیمت ایک چلّو خون ہے۔ اس لئے کہ تیری سلطنت میں دولت کا تنور محنت کی ہڈیوں سے سلگایا جاتا ہے۔ اس لئے کہ تیری سلطنت میں یزدان کی نعمتیں سمیٹی جارہی ہیں۔ انھیں بکھرنا چاہئے مگر سمٹ رہی ہیں۔ سو گھروں کا حصہ ایک گھر میں سمٹ رہا ہے —— سو ہاتھوں کی مزدوری ایک ہاتھ میں پہونچ رہی ہے۔

— تو مقدس باپ مجھے ہدایت کر کہ میں کیا کروں؟

— جاگیردارانہ نظام کو موت دے۔ کوٹھیوں کا منھ کھول دے۔ جیبوں کا بوجھ ہلکا کر۔ صندوقوں کے قفل توڑ ڈال اور یزدان کی نعمتوں کو اس طرح بانٹ کہ کسی کی مٹھی خالی نہ رہے۔

— مقدس باپ ایسا ہی ہوگا۔

— جس ملک میں دوزخ کے سانپ تاجروں کے بھیس میں رینگتے ہوں اُس ملک میں سونے اور چاندی کے سکے آخرت کے بچھو بنکر روحوں کو ڈستے ہیں۔ وہاں محنت جھوٹی اور جنس کھوٹی ہوتی ہے — وہاں

ایمان سستا اور روٹیاں مہنگی ہوتی ہیں ---- اس لئے تجارت کو جرم قرار دے۔ جس تمدن کی بنیاد تجارت پر ہو وہ ظلم کا پیڑ ہے جس میں ہنسی نہیں پھل سکتی ---- اس درخت کو جڑ سے کاٹ دے۔

---- مقدس باپ! مگر لوگوں کی ضرورت؟

---- ضرورت! اس کا نام نہ لے۔ اس کی آنکھوں میں ہمیشہ آنسو رہتے ہیں۔ اس کو اپنی مملکت سے باہر نکال دے۔ اس کی جگہ فرض کو بلا جس کے چہرے پر ہمیشہ ہنسی رہتی ہے۔ فرض کی رہنمائی میں اُگانے والے اُگائیں۔ بنانے والے بنائیں اور بانٹنے والے بانٹ دیں۔

---- مقدس باپ! ایسا ہی ہوگا ---- اور ایسا ہی ہوا۔ ضرورت ملک دور ہوئی فرض نے اپنا تیشہ اُٹھایا اور زندگی اس کے اشاروں پر حرکت کرنے لگی، بڑھاپے نے جوانی کی انگڑائی لی اور جوانی بچپن کی طرح مسکرائی، مگر پھر بھی سب کے چہروں پر ہنسی نہ تھی "جہاں انصاف انتقام لے وہاں سب کے چہروں پر ہنسی نہیں رہ سکتی" مقدس باپ نے کہا۔ مجرموں کی خطائیں معاف کردی گئیں اور سزا کی جگہ ان کی تربیت ہونے لگی۔ جرائم کی تعداد خود بخود کم ہوگئی۔ مگر پھر بھی بعض کے آنکھوں میں آنسو تھے ---- وہ رو رہے تھے اپنے پیاروں کی موت پر۔ مقدس باپ نے کہا "موت اس کائنات میں کہیں نہیں ہے۔ زندگی بھیس بدلتی ہے اور اسی کا نام لوگوں نے موت رکھ لیا ہے ---- موت روح کا ایک سفر ہے۔ جو تم سے بچھڑ چکے ہیں وہ تم سے ضرور ملیں گے۔ یزداں کا وعدہ جھوٹا نہیں ہوتا" رونے والے چُپ ہوگئے۔ موت پر رونا بند ہوگیا پھر بھی کبھی کبھی زندگی کے کراہنے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ مقدس باپ نے سلطنت کے طبیبوں کو جمع کرکے کہا "یہ بیماروں کی کراہ ہے۔ کیا تم ایسی کوشش نہیں کر سکتے کہ لوگ بیمار نہ پڑیں۔ تم کوشش کرو میں یزداں سے تمہاری سفارش کردوں گا ---- طبیبوں کی کوششیں بار آور ہوئیں اور بیماریوں کی نسل بھی جرائم کی نسل کی طرح منقطع ہوگئی۔

(۴)

ایک رات جبکہ فضا کا سناٹا کسانوں کے جھونپڑوں میں متمکن کے احساس کو لوری دیکر سلا رہا تھا کسی کے دل کی چیخیں دفعتاً گیت بننے لگیں اور گیت کی آواز اندھیرے کو چیرتی ہوئی مقدس باپ کے کانوں تک پہونچی "یہ گیت نہیں آنسوؤں کی بارش ہے" یہ کہتا ہوا وہ آواز کی سمت آہستہ آہستہ بڑھا ---- ایک نوجوان جس کے چہرے کی زردی اس کی حالت کی گواہ تھی اپنی دھن میں کچھ گا رہا تھا ---- "میرے بیٹے یہ کیا کر رہا ہے؟" مقدس باپ نے پوچھا۔ "گا رہا ہوں" اس نے مقدس باپ کی تعظیم کے لئے کھڑے ہوتے ہوئے کہا "گا نہیں رہا ہے، رو رہا ہے۔ اپنے باپ کو دھوکہ نہ دے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تیرے دل کی گہرائی

میں آنسو اس طرح لہریں لے رہے ہیں جس طرح پہاڑی ندیاں ریت کے نیچے بہتی ہوں۔ بتا تجھے کیا تکلیف ہے؟"۔ مقدس باپ کے اس سوال کے جواب میں اس کے دل کا اُبال واقعی آنسو بنکر نکلا۔

—— "مجھے ایک عورت سے محبت ہے مگر وہ میری ہر تمنا کو ٹھکراتی ہے"۔

—— "کیوں ٹھکراتی ہے"

—— "یہ مجھے معلوم نہیں"

—— "وہ گنہگار ہے۔ اس نے آنسوؤں کو جنم دیا۔ وہ گنہگار ہے اُس نے تیری ہنسی چھینی۔ وہ گنہگار ہے۔ وہ گنہگار ہے —— مجھے میری گنہگار بیٹی کے پاس لیچل"—— جوان اسے اپنی محبوبہ کے پاس لے گیا۔ "تو نے اسکی ہستی کیوں چھینی؟ ——" مقدس باپ نے اپنی گنہگار بیٹی سے پوچھا۔

—— "میں نے اس کا کچھ نہیں چھینا۔ ہاں جو یہ چاہتا ہے میں اسے پورا نہیں کر سکتی؟" اس نے مقدس باپ کے قدم چومتے ہوئے کہا۔ "تو کیا چاہتا ہے؟" مقدس باپ نے اس جوان سے پوچھا۔

—— میں! مقدس باپ میں۔ میں اس کے ہونٹ چومنا چاہتا ہوں۔ میں اس کو اپنے سینے سے چمٹانا چاہتا ہوں۔ میں اس کے گداز جسم کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لیکر بھینچنا چاہتا ہوں ----- میں میں وہ سب کچھ چاہتا ہوں جو ایک مرد ایک عورت سے چاہ سکتا ہے"

—— تو ہے میری بیٹی تو یہ کھیل اس کے ساتھ کیوں نہیں کھیل سکتی؟ کیا اس کے چوم لینے سے تیرے ہونٹ گھس جائیں گے۔

—— نہیں! مگر میرا جی نہیں چاہتا۔

—— مگر اس کا تو چاہتا ہے۔ کیا تو دوسروں کے لئے اتنا بھی نہیں کر سکتی۔ تو گنہگار ہے، تو گنہگار ہے، ہر وہ شخص گنہگار ہے جو اختیار رکھتے ہوئے دوسروں کی خواہش کو پورا نہ کر سکے —— یزداں اُس سے کبھی خوش نہیں ہو سکتا جو مانگنے والے کا ہاتھ جھٹک دے۔

—— تو مقدس باپ! کیا میں اسے اپنی عصمت حوالے کر دوں؟

—— عصمت! اہرمن کا جنا ہوا لفظ، حسد کی گڑھی ہوئی اصطلاح، خود غرضی کی ڈھالی ہوئی زنجیر۔ گنہگار بیٹی تو اہرمن کی بہکائی ہوئی ہے۔ روٹی اس کی ہے جسے بھوک ہو۔ عورت اس کی ہے اُن سبھوں کی ہے جنہیں اُس سے محبت ہو۔

—— اور مقدس باپ اولاد؟

—— سلطنت کی —— یزداں کی سلطنت کا یہی قانون ہے۔ گنہگار لڑکی اپنے خدا سے معافی مانگ

اور اس اپنے بھائی کی خواہش پوری کر - یزداں تجھے اپنی پناہ میں رکھیگا - (عورت چپ چاپ کھڑی سنتی رہی)
—— چُپ کیوں ہے؟ کیا تو اپنے باپ کی سفارش اور یزداں کا فرمان نہیں سنے گی؟
—— سنوں گی مقدس باپ!
—— شاباش! میں تجھے یزداں کی خوشنودی کی بشارت دیتا ہو —— (مقدس باپ نے دونوں کی پیشانی چومی اور چلا گیا -)

(۵)

دوسرے دن شاہی محل کے سامنے دارالسلطنت کے تمام مردوں اور عورتوں کا ہجوم تھا - مقدس باپ آج انھیں یزداں کا ایک پیغام سُنانے والا تھا - وہ اپنی آنکھوں میں عقیدت کے ولولے اور چہروں پر شوق کی بے چینی لئے اس کا انتظار کر رہے تھے کہ شاہی نقیبوں کی آواز بلند ہوئی - مقدس باپ محل کی سیڑھیوں سے اُترتا نظر آیا اس حالت میں کہ بادشاہ کے ہاتھ میں چتر تھا اور شہزادیاں اس کے سر پر مورچھل ہلا رہی تھیں - وہ ہجوم کے قریب پہونچ کر ایک اونچے چبوترے پر چڑھ گیا اور وہاں سے اس نے ہاتھ اُٹھا کر مجمع کو مخاطب کیا -
"اے گروہ یزداں، خدا تمھیں اہرمن کے شر سے محفوظ رکھے - ہم اس کائنات میں اہرمن کی تخلیق ہیں اور تکلیفیں اس کی بیٹیوں کی جنی ہوئی اولادیں —— آگاہ ہو کہ یزداں اپنی سلطنت میں کسی ماتھے پر شکن کسی ہونٹ پر کراہ اور کسی آنکھ میں آنسو نہیں دیکھنا چاہتا - اس نے مجھے بھیجا ہے کہ میں اپنی لاٹھی سے ان تمام فتنوں کا سر کچل دوں جو تکلیفوں کو جنم دیکر ان کی پرورش کرتے ہیں - میرے بیٹے کیقباد نے میرے اشارے سے حکومت کا تاجرانہ نظام بدل کر ان تمام تکلیفوں کا گلا گھونٹ دیا جو نتیجہ تھیں اہرمن کے بنائے ہوئے سماجی اُصولوں کا — تمام دُکھوں کا خاتمہ ہو گیا - صرف ایک دُکھ باقی ہے جو اب تک تمہارے دل کی دھڑکنوں میں سانس لے رہا ہے - اور اس کا نام ہے تمھاری زبان میں عشق، یہ عشق کیا ہے - تمھاری بہت سی خواہشوں کی طرح ایک خواہش - اور آگاہ ہو کہ تمھاری ہر خواہش تمھارے جسموں کی ترکیب میں یزداں کی ایک مرضی ہے اور اسے پورا نہ ہونے دینا یزداں کی نافرمانی ہے - اس لئے میں اعلان کرتا ہوں کہ آج سے کیقباد کی سلطنت میں عصمت کا تصور گناہ ہے - اے یزداں کی مملکت میں بسنے والو اور بسنے والیو! اپنے کانوں کو میری آواز کے قریب لاؤ - میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ تم میں سے جس کو جسکی خواہش ہو اس کو یزداں کا حکم ہے کہ اپنا جسم خواہش کرنے والے کے حوالے کر دے —— قبل اس کے کہ اس کے خون کا کوئی قطرہ اس کی آنکھوں سے آنسو بنکر ٹپکے —— اور ٹپک کر یزداں کی کھیتی میں اہرمن کا بکھیرا ہوا بیج بن جائے - میں اعلان کرتا ہوں کہ جو کنواری لڑکی اپنے مانگنے والوں کو اپنی دوشیزگی ہدیہ کرے گی اس کی جنی ہوئی اولاد آج سے قوم کی اولاد سمجھی

جائے گی اور سلطنت اس کی پرورش کرے گی - میں اعلان کرتا ہوں کہ حُسن جہاں بھی ہو، جس کے پاس بھی ہو یزداں کی دوسری بخششوں کی طرح قوم کا مشترکہ سرمایہ ہے اور قوم کا ہر فرد اس سے تسکین چاہنے کا مجاز ہے میں اعلان کرتا ہوں کہ اگر جوانی بڑھاپے کی خواہش کا احترام نہ کرے گی، اگر خوبصورتی بدصورتی کے لئے اپنا آغوش نہ کھولے گی تو بہشت کے دروازے تم پر ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں گے اور یزداں کا عذاب تمہاری کھیتیوں پر بارش بنکر برسے گا - اے مردو! آگاہ ہو کہ اگر تم نے اپنی عورتوں کو ان کے چاہنے والوں کے پاس جانے سے روکا اور ان کی باہر سے لائی ہوئی اولاد کو اپنی اولاد نہ سمجھا تو زمین اپنے خزانے اُگلنا بند کر دیگی- اے عورتو! آگاہ ہو کہ اگر تم نے اپنے چاہنے والوں کے جذبات کی پذیرائی کرنے میں خیانت کی تو تمہاری صورتیں مسخ ہو جائیں گی اور تمہاری چھاتیوں کا دودھ اس طرح خشک ہو جائے گا جس طرح موسم گرما میں چشمے -"

مقدس باپ نے اپنی تقریر ختم کر کے ابھی پہلا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ ہجوم سے ایک شخص نے سر نکال کر کہا "مقدس باپ! جب یزدان کا حکم یہی ہے تو عورت مرد میں شادی کا رشتہ کیوں رکھا جائے؟"---- "خاموش رہ تجھے اہرمن نے بہکا دیا ہے ---- یزدان تیرے مشورے پر عمل نہیں کر سکتا - زندگی کی گاڑی دو پہیوں سے چلتی ہے ایک عورت اور ایک مرد - سماج نام ہے گھروں کے مجموعے کا اور گھر عورت اور مرد کے جوڑے کے بغیر نہ بن سکتا ہے نہ چل سکتا ہے ---- میرے بیٹے بیٹھ جا! یزدان کا شیر بننے کی کوشش نہ کر -" وہ بیٹھ گیا تو مقدس باپ نے بادشاہ کی طرف مخاطب ہو کر کہا "کیقباد! گواہ رہنا کہ میں نے تیری قوم کو اپنے مالک کا پیغام پہونچا دیا" ---- یہ کہہ کر اس نے شہزادیوں کو حکم دیا کہ اپنے چہروں سے نقابیں ہٹا دیں- نقابیں چہروں سے سرکنے لگیں ---- اس نے پھر مجمع کو خطاب کیا "تم میں سے اگر کسی کے دل میں ان شہزادیوں کے لئے خواہش پیدا ہو رہی ہو تو وہ اُٹھے اور سوال کرے" - ہجوم سے ایک چرواہے نے نکل کر ایک شہزادی کی طرف اشارہ کیا - اس کے ساتھ ہی مقدس باپ کی نگاہیں بادشاہ کے داماد کی طرف مڑیں اس نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر اپنی بیوی کا ہاتھ اس چرواہے کے ہاتھ میں دیدیا - مجمع سے نعرۂ مسرت بلند ہوا اور مقدس باپ نے بادشاہ کے داماد کی پیشانی چومتے ہوئے کہا "میں تجھے بشارت دیتا ہوں کہ تیری جگہ یزدان کے دل میں ہے"-

(۶)

یزدان کا پیغام مملکت کے گوشے گوشے میں پہونچ گیا - عصمت نے اپنا ملبوس اُتار ڈالا اور زہد نے اپنی کملی پھینکدی - مجنونوں کو لیلائیں مل گئیں اور رادھاؤں کو کرشن - فلسفی شاعر بن گئے اور زہاد مغنی - کیوپڈ نے تیر پھینک کر بانسری اُٹھالی اور زندگی اس کے نغموں کی لہروں پر رقص کرنے لگی ---- مگر مقدس باپ کا دل

اب بھی پوری طرح مطمئن نہ تھا - چنانچہ ایک شب جب کہ بادشاہ اپنی ملکہ کے ساتھ اپنی خوابگاہ میں جا رہا تھا اس نے آگر اس سے سوال کیا "کیا آج رات بھر کے لئے تو اپنی ملکہ کو میرے جھونپڑے میں بھیج دے سکتا ہے"۔ بادشاہ نے ادب سے گردن جھکاتے ہوئے ملکہ کو اشارا کیا - ملکہ آگے بڑھی —— مقدس باپ نے اسکے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "بیٹی واپس جا - مجھے یزداں نے اس دنیا کی تمام عورتوں اور مردوں کا باپ بنا کر بھیجا ہے - اس لئے دنیا کی ہر عورت مجھ پر اسی طرح حرام ہے جس طرح بیٹی باپ پر —— یہ تیرے شوہر کا امتحان تھا —— کیقباد تو امتحان میں پورا اترا - اب مجھے یقین ہو گیا کہ میرے بکھیرے ہوئے بیج تیرے تاج کے سایہ میں پروان چڑھ کر رہیں گے"۔

(۷)

ایک دن مقدس باپ عالمِ استغراق میں یزداں سے باتیں کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یکایک اس کے جھونپڑے میں قہقہوں کی ایک گونج سنائی دی - کوئی کہہ رہا تھا "ہر خواہش پوری نہیں ہو سکتی"۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور زمین پر اہرمن کا نام لکھ کر اس پر اپنی لاٹھی سے کئی ضربیں لگائیں - مگر وہ آواز اسی طرح جھونپڑے میں گونجتی رہی - اس نے گھبرا کر یزداں کا نام لیا اور کچھ دعائیں پڑھنی شروع کیں لیکن وہ آوازیں اسی طرح اس کے مراقبے کا تصور کرتی رہیں —— یہاں تک کہ جب اُسے پوری طرح یقین ہو گیا کہ یہ آواز اہرمن کے کسی چیلے کی آواز نہیں بلکہ خود اس کے ضمیر کی پکار ہے تو اس نے اپنا عصا اور کملی اُٹھائی اور شاہی محل میں پہونچ کر بادشاہ سے کہنے لگا "میری چھاگل کو پانی سے بھر دے اور میری جھولی میں تھوڑی سی روٹیاں ڈال دے - میں تیری مملکت کے چاروں کونوں کا گشت لگا کر یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ کسی کے دل میں کوئی خواہش ناآسودہ تو نہیں ہے"۔ بادشاہ نے گردنِ اطاعت خم کی اور ملکہ نے اپنے ہاتھوں اس کی چھاگل میں پانی اور جھولی میں روٹیاں بھر دیں، مقدس باپ دونوں کو دعائیں دیتا ہوا سفر کے لئے روانہ ہوا۔

"مقدس باپ کب تک لوٹے گا" بادشاہ نے پوچھا

"جلد لوٹوں گا —— دیر ہو جائے تو مایوس نہ ہونا - میں جلد لوٹوں گا"۔ مقدس باپ نے اپنا عصا کاندھے پر رکھتے ہوئے جواب دیا اور چل پڑا۔

(۸)

مقدس باپ دیہاتی زندگی کے زمزمے سنتا ہر بستی کو اپنے نقشِ قدم سے زیارت گاہ بناتا چلا جا رہا تھا کہ دفعتاً ایک مکان کی چار دیواری سے رونے کی آواز بلند ہوئی - کوئی لڑکا بلک بلک کر رو رہا تھا - اہرمن لڑکوں کو بھی رُلاتا ہے - لیکن اس کی کونسی خواہش پوری نہیں ہو رہی ہے؟" یہ کہتا ہوا وہ مکان کی طرف بڑھا اور

دروازے پر پہونچکر اپنی لاٹھی سے دستک دی - ایک عورت ایک لڑکے کے ساتھ نکلی اور مقدس باپ کو پہچان کر اس کے قدموں کو بوسہ دیا -

— بیٹی تیرا یہ بچہ کیوں رو رہا ہے ؟

— سلطنت کی طرف سے اس کے حصّے کا جو کھلونا ملا تھا وہ ٹوٹ گیا - اب یہ چاہتا ہے کہ دوسرے بچے کا کھلونا بھی میں اسے چھین کر دیدوں - یہ میں کیسے کر سکتی ہوں -

— اسے اگر اسی طرح اپنے حصّے سے زیادہ مانگنے کی عادت پڑگئی تو یہ جوان ہو کر سلطنت کے لئے ایک خطرہ بن جا سکتا ہے - اس لئے اس کی خواہشوں کی تربیت کر -

— لیکن مقدس باپ کا فرمان ہے کہ ہر خواہش معصوم ہے -

— ہاں ہر وہ خواہش معصوم ہے جو یزدان کی پیدا کی ہوئی ہو -

— تو کیا کچھ خواہشیں اہرمن کی پیدا کی ہوئی بھی ہوتی ہیں ؟

— ہاں وہ خواہشیں جن سے کسی دوسرے کو نقصان پہونچ جانے کا اندیشہ ہو -

— تو مقدس باپ یہ بھی بتلا دیں کہ اسی خواہشوں کو کیسے دبایا جا سکتا ہے -

— "مجھے سوچنے کی مہلت دے - اس سوال کا جواب میں لوٹ کر دوں گا" مقدس باپ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا اور آگے بڑھ گیا -

(۹)

دوسرے دن اس کا گزر ایک شہر میں ہوا - شہری عید کی خوشیاں منا رہے تھے اور زندگی ان کے نغموں کی لہروں میں بہی جا رہی تھی - مگر جشنِ نشاط کے ان ہنگاموں سے دور ایک نوجوان کسی فکر میں کھویا ہوا شہر پناہ کی دیوار کا سہارا لئے بیٹھا تھا - مقدس باپ نے دیکھا کہ اس کے چہرے سے غمگینی ٹپک رہی ہے -

— کیا سوچ رہا ہے ؟ کیا تیرے ذمّے سلطنت کا کوئی کام نہیں ہے ؟

— کام سے ابھی فرصت ملی ہے اس لئے آرام کر رہا ہوں -

— مگر تو غمگین کیوں ہے ؟ کیا تو نہیں جانتا کہ کیقباد کی سلطنت میں غمگین رہنا جرم ہے ؟

— میں غمگین تو نہیں ہوں مقدس باپ !

— تو غمگین نہیں ہے ! میں غمگینی کو تیری پیشانی کی سطروں میں پڑھ رہا ہوں - بتا تیرے دل میں کیسی گرہ ہے ؟

— جو گرہ ہے وہ مقدس باپ کی نگاہ سے چھپی نہ ہوگی - میں بھوکا ہوں - مجھے اعزاز کی بھوک ہے - مجھے زاز چاہئے - میرا ایک دوست جو میرے ساتھ کا کھیلا ہوا ہے آج سلطنت کے ایسے عہدے پر ممتاز ہے کہ

جدھر سے وہ گزرتا ہے لوگ اسے سلام کرتے ہیں - وہ ہاتھ اُٹھا کر بانٹتا ہے لوگ ہاتھ پھیلا کر اس کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں - میرا دل چاہتا ہے کہ میں بھی اُسی کی طرح بانٹا کروں اور لوگ میرے سامنے ہاتھ پھیلایا کریں - کیا مقدس باپ کی سفارش سے مجھے بھی کوئی ایسا عہدہ مل سکتا ہے -

—— مل سکتا ہے - لیکن ملک کا ہر باشندہ اگر اس سے یہی خواہش کرے تو مقدس باپ کیا کر سکتا ہے - کیا تو نہیں جانتا کہ عہدے تھوڑے ہیں اور لوگ زیادہ - اس لئے کیا تو اپنی اس خواہش کو دبا نہیں سکتا ؟

—— مقدس باپ ! مجھے بتلائیے کہ میں کس طرح اپنی اس خواہش کو دبا سکتا ہوں ؟

—— یہ میں لوٹ کر جواب دوں گا - میری واپسی کا انتظار کر -

(۱۰)

شام ہو رہی تھی اور شام کا جھٹ پٹا رات کی تاریکی میں تبدیل ہو رہا تھا - آسمان کے مشرقی گوشے میں ابر کے کچھ پھیلتے ہوئے ٹکڑے افق کی شفق آلودگی کو اس طرح میلا کر رہے تھے جس طرح کاجل پھیل کے گلابی رخسار کو - مقدس باپ فطرت کے ان مناظر پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ پھینکتا آگے بڑھ رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے پکارا " مقدس باپ !" - مقدس باپ نے مڑ کر دیکھا تو اس کا وہی بیٹا سامنے کھڑا تھا جسکے غمگین نغموں نے ایک اندھیری رات میں اس کی نیند اُچاٹ دی تھی -

—— کیا ہے میرے بیٹے تو پھر مجھے غمگین نظر آ رہا ہے !

—— ہاں میرے باپ میں غمگین ہوں - مجھے تیری اس بیٹی نے غمگین بنا رکھا ہے - جس سے تو نے میری سفارش کی تھی -

—— تو کیا اس نے یزدان کے فرمان کو خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنا جسم تیرے حوالے نہیں کیا ؟

—— ہاں کیا میرے باپ - اُس نے میری ہر تمنا کو آسودگی بخشی - میری ہر خواہش کو پورا کیا -

—— تو پھر تو غمگین کیوں ہے ؟

—— میں اس لئے غمگین ہوں کہ وہ سب کچھ کرنے کے باوجود مجھ سے محبت نہیں کر سکتی - اس کا دل ہرن جیسی آنکھوں والے اس نوجوان سے اٹکا ہوا ہے جو گیت بناتا ہے اور فضا میں اُسے اُچھالتا پھرتا ہے -

—— تو کیا اس لڑکی کو تیری طرح کسی کی خواہش کرنے کا حق نہیں ہے ؟

—— ہے کیوں نہیں - لیکن میں اپنے دل کو کیونکر سمجھاؤں جو یہ چاہتا ہے کہ وہ میرے لئے بھی اسی طرح بےچین رہے جس طرح اس مغنی شاعر کے لئے بےچین رہتی ہے - اُسے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں جو چمک پیدا ہوتی ہے وہ مجھے دیکھ کر کیوں نہیں پیدا ہوتی - میں چاہتا ہوں ---------

—— سب کچھ تو ہی چاہے گا یا دوسرے بھی کچھ چاہ سکتے ہیں۔ آخر تیری خواہش اس کے جسم کو اپنے آغوش میں لیکر کیوں تسکین نہیں پاتی۔ یہ خواہش ہے جو پوری ہو کر بھی آسودہ نہیں ہوتی ؟

—— کیسے آسودہ ہو مقدس باپ ؟ تم نے محبت کو صرف آب و گل کا تقاضا سمجھ رکھا ہے اور وہ ہے روح کا مطالبہ !

—— روح کا مطالبہ ؟ مقدس باپ کی آنکھوں سے تشکیک کی حیرت ٹپک رہی تھی۔

—— ہاں مقدس باپ ! کیا تم اس کی روح میں ایسی تبدیلی نہیں کر سکتے کہ وہ مجھ سے پیار کرنے لگے۔

—— نہیں کر سکتا —— مقدس باپ کی آواز بیچارگی کے احساس سے گری پڑ رہی تھی۔

—— تو پھر مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں۔

—— کیا تو اپنی خواہش کو دبا نہیں سکتا

—— مقدس باپ تمہیں بتاؤ کہ میں اپنی خواہش کیونکر دباؤں ؟

"اس سوال کا جواب میں ابھی نہیں دے سکتا" یہ کہکر وہ آپ ہی آپ کچھ بولتا ہوا آگے بڑھا "روح کا مطالبہ، روح کا مطالبہ محبت کیا سچ مچ روح کا مطالبہ ہے، لیکن ایک روح کے مطالبہ کا جواب دوسری روح کیوں نہیں دیتی ؟ یہ سوال تو یزداں سے پوچھنے کا ہے آخر اس نے روحوں کو ایسا کیوں بنایا"

اس کے دماغ اور دل کی یہ سرگوشی ابھی جاری تھی کہ پیچھے سے کسی نے پکارا "مقدس باپ" - مقدس باپ ٹھہر گیا - دو نوجوان دوڑتے ہوئے اس کی طرف آئے اور زہن خدمت چوم کر ہانپتے ہوئے ہوئے بولے۔ مقدس باپ تم جب یزداں کی سلطنت سے تمام غموں کا خاتمہ کر دینے کا ٹھیکہ لیکر یزداں کی طرف سے آئے ہو پھر ہمارے دلوں میں غم کیوں پرورش پا رہا ہے۔

—— بتلاؤ میرے بیٹو تمہیں کون سا غم ہے۔

پہلا —— مجھے گیت بنانے کا شوق ہے اور میرا ایک دوست ہرمز بھی گیت بناتا ہے عورتیں اس کا گیت سن کر دیوانی ہوئی جاتی ہیں اور میرا گیت کوئی نہیں سنتا میں چاہتا ہوں کہ میں بھی اسی کی طرح گیت بنا سکوں اسی طرح گا سکوں۔

—— یہ کیونکر ہو سکتا ہے میرے بیٹے سب کی صلاحیتیں برابر نہیں ہوتیں۔

—— لیکن کیوں برابر نہیں ہوتیں میں نے یزداں کا کیا بگاڑا تھا۔

—— یہ میں یزداں سے پوچھ کر بتا سکوں گا —— (دوسرے سے) تجھے کیا غم ہے۔

دوسرا —— میرے ایک رشتہ دار نے مجھے ذلت دی ہے میرا آرام چھینا ہے مجھے نقصان پہونچایا ہے میں اس سے

انتقام لینا چاہتا ہوں لیکن آج وہ اعزاز کی ایک ایسی بلندی پر بیٹھا ہے جہاں میرا ہاتھ پہونچکر اس کا گلہ نہیں گھونٹ سکتا۔

—— گنہگار لڑکے تجھے انتقام کی پیاس ہے اور یہ پیاس اہرمن کی پیدا کی ہوئی ہے۔ اس پیاس کے متعلق یزدان کی مرضی تجھے معلوم نہیں ہے؟

—— معلوم ہے مقدس باپ مجھے معلوم ہے کہ دشمن کو معاف کر دینے ہی میں یزدان کی خوشنودی ہے، لیکن میں کیا کروں کہ میرا دل معافی کے تصور سے راضی نہیں ہوتا۔ اپنی بے بسی پر کڑھتا ہے گھلتا اور آنسو بنکر آنکھوں سے بہہ جانا چاہتا ہے —— میرے باپ تمھیں میرے دل کو سمجھا دو تم نے سلطنت کا نظام بدل دیا میرا دل نہیں بدل سکتے۔

—— نہیں بدل سکتا میرے بیٹے نہیں بدل سکتا

—— تو بتاؤ کہ میں کیا کروں۔

—— اپنی اس خواہش کو دبانے کی کوشش کر۔

—— تو پھر یہی بتائے جاؤ کہ میں کیونکر اپنی اس خواہش کو دبانے کی کوشش کروں۔

مقدس باپ اس سوال پر بالکل خاموش ہوگیا۔

—— چُپ کیوں ہو گئے مقدس باپ جواب دو۔

—— نہیں جواب دے سکتا۔

—— تم جواب نہ دو گے تو پھر کون جواب دے گا۔

—— "یزدان دے گا" —— میں یزدان کے پاس جاؤں گا تیرے اس سوال کو لیکر —— اس کی دنیا میں صرف پیٹ ہی بھوکے نہیں ہیں غرور بھی بھوکا ہے، شہوت بھی بھوکی ہے، محبت بھی بھوکی ہے انتقام بھی بھوکا ہے، سب بھوکے ہیں، میں کس کس کی بھوک بجھاؤں اگر یہ ساری بھوکیں اہرمن کی پیدا کی ہوئی ہیں تو یزدان نے ان کے لئے اب تک کیا کیا۔ یہ سوال اسی سے پوچھنے کا ہے؟ میں اس کے پاس جاؤں گا اور اپنی اس لاٹھی سے اس کے بند دروازے کی کنڈی کھٹکھٹا کر پوچھوں گا کہ "اگر تیری دنیا کا نظم خواہشوں کو دبا دینے ہی سے ٹھیک ہو سکتا تو بتا کہ خواہشوں کو کس طرح دبایا جائے۔ یہ کہکر وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ نوجوان نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ مقدس باپ طوفان آرہا ہے۔ تھوڑی دیر میرے اس جھونپڑے میں چل کر ٹھیرو۔ نہیں ٹھہر سکتا۔ میں یزدان کے پاس جا رہا ہوں۔ مجھے جلد جانا ہے اور جلد لوٹنا ہے میرا انتظار کر میں جلد لوٹوں گا۔ یہ کہکر وہ بڑبڑاتا ہو ہنپتا ہوا آگے بڑھا اس عالم میں آندھی چل رہی تھی

دل گرج رہے تھے اور وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ ساری کائنات ایک زبان ہو کر اس سے یہ پوچھ رہی ہے
" خواہشوں کو کس طرح دبایا جائے"
وہ آگے بڑھتا گیا یہاں تک کہ سامنے کی تاریک گھاٹیوں نے اسے اپنے اندر گم کر لیا ــــــــ
ــــــ "وہ یزداں کے پاس پہونچ گیا یا ابھی راستے میں ہے" ــــــ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا، معلوم ہے صرف اتنا کہ وہ چلا گیا ــــــ اور اب تک نہیں لوٹا۔ اس کی اُمت اس کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی، مگر وہ نہیں لوٹا۔ کیقباد اس کی راہ تکتے تکتے شاید اسی کے پاس پہونچ گیا مگر وہ نہیں لوٹا ــــــ کیقباد کے بیٹے نوشیرواں نے اپنے جاگیرداروں کی زبان سے عادل کا لقب حاصل کرنے کے شوق میں اسکے حواریوں اور معتقدوں کو چُن چُن کر موت کے گھاٹ اُتار دیا مگر وہ نہیں لوٹا ــــــ وہ چلا گیا اور شاید ہمیشہ کے لئے چلا گیا لیکن یہ سوال کہ "خواہشوں کو کس طرح دبایا جائے؟" ــ آج بھی اسی طرح فضا میں گونج رہا ہے۔

جمیل مظہری ام - اے

یاد رکھئے!
بیوٹرین رجسٹرڈ
کیل، جھائیوں - بدنما داغوں پھوڑے پھنسیوں - بھورے تل مہاسوں - داد، چنبل، خارش - اگزیمہ اور جلدی بیماریوں کا مکمل علاج ہے
قیمت :- ۱۲ - بڑا سائز ۱/۴
آپکے شہر کے تمام جنرل مرچنٹ اور کیمسٹ سے ملتی ہے
اور
رجسٹرڈ
بیوٹرین سنو
آپ کی خوبصورتی و ملاحت کو قایم رکھنے کے لئے ہے
قیمت پندرہ آنے
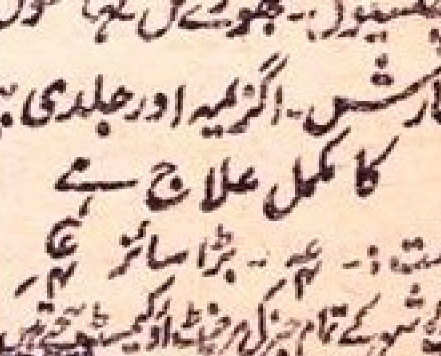
کیمکل مینوفیکچرنگ کمپنی بمبئی
سول ایجنٹ: ایس - بی - احمد - نہر سعادت خاں، طوطا میڈ دہلی

اشتہار دینا حرام ہے بس اس سے زیادہ میرے پاس کوئی صداقت نہیں ہے ــــ ماننا نہ ماننا آپ کا فعل ہے۔
خون عنبری یہ دوا دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے ولایت میں اسکے مداح موجود ہیں۔ دماغی کمزوری کے لئے اکسیر صفت ہے بوڑھے، سب کھاتے ہیں، اس دوا کے مقابلہ میں سیکڑوں قیمتی ادویات اور مقویات بیکار ہیں۔ اس سے بھوک اس قدر بڑھتی ہے کہ دو تین سیر دودھ اور پانی ہضم کر سکتے ہیں، اس قدر مقوی دماغ ہے کہ بچپنے کی باتیں بھی خود بخود یاد آنے لگتی ہیں، اس کو مثل آبحیات کے تصور فرمائیے۔ اسکے استعمال کرنے سے پہلے اپنا وزن کر لیجئے۔ ایک شیشی چھ سات سیر خون آپ کے جسم میں اضافہ کر دیگی اسکے استعمال سے دن بھر کام کرنے سے مطلق تھکن نہ ہوگی۔ یہ دوا رخساروں کو مثل گلاب کے پھول کے اور مثل کندن کے درخشاں بنا دیگی۔ یہ نئی دوا نہیں ہے ہزاروں مایوس العلاج اس کے استعمال سے بامراد ہو کر مثل پندرہ سولہ سال کے جوان بن گئے یہ نہایت درجہ کی دوا ہے کہ آپ صبر و تحمل نہیں کر سکتے۔ القصہ اسکی صفت تحریر میں نہیں آ سکتی تجربہ کر کے دیکھ لیجئے اس سے بہتر مقوی دوا دنیا بھر میں نہیں ہے۔
قیمت فی شیشی چار روپیہ (للعہ)
(نوٹ) فایدہ نہ ہو تو قیمت واپس۔ فہرست دواخانہ مفت منگائیے۔
خداوند کو حاضر و ناظر جان کر لکھتا ہوں کہ یہ دوا اکسیر کا کام کرتی ہے۔ نقالوں سے ہوشیار رہئے۔ میری ۵۰ سالہ شہرت پر غور فرمائیے۔
المشتہر: حکیم ثابت علی بیجی زبان خوش کلام (عالم تنوی مولانا محمد عظیم صاحب)
محمود نگر ۳ لکھنؤ

ترکی میں ابتدائی تعلیم

ترکی میں ابتدائی تعلیم زمانۂ حال کے جدید ترین اُصول کے عین مطابق ہے، اور اپنے اندر ایک خاص جدت وندرت بھی رکھتی ہے جس کو ترکی کی نازک ادبی خصوصیات، اور اُس کے مخصوص اندازِ بیان و اسلوبِ تحریر کا نتیجہ سمجھنا چاہئے۔ اور یہ تمام تر تعلیمی اصلاحات اتاترک اعظم کی مرہونِ منت ہیں جس نے ترکی قوم کو دوبارہ زندگی بخشی جبکہ وہ آخری سانسیں لے رہی تھی، جس نے ترکوں کو ہلاکت سے بچاکر دنیا کی زندہ قوموں کی صف میں لاکر کھڑا کر دیا، جس نے اپنی قوم کو توہم پرستی، بے علمی، اور جہالت سے نکال کر حقایق سے روشناس کیا جن کو سمجھے بغیر آج کوئی قوم دنیا میں زندہ رہنے کا حق نہیں رکھتی۔

مصطفےٰ کمال نے ترکی زندگی کے ہر شعبہ میں عظیم الشان اصلاحات کیں اور انھیں اصلاحات کے منجملہ ابتدائی تعلیم کی جدید صورت بھی ہے جس کے متعلق ہم کچھ لکھنا چاہتے ہیں، اس ذیل میں سب سے پہلی اصلاح رسم خط کی تبدیلی ہے، یعنی پہلے ترکی زبان عربی رسم خط میں لکھی جاتی تھی اور اب رومن حروف میں لکھی جانے لگی۔ یہ تغیر محض یوروپ کی کورانہ تقلید پر مبنی نہیں ہے بلکہ ایسا کرنا ترکی زبان کو ترقی دینے کے لئے ناگزیر ہو گیا تھا، اور یہ اس لئے کہ عربی رسم خط ترکی زبان کے مخصوص تلفظ کی ترجمانی سے بالکل قاصر تھا، اور یہ خرابی عربی حرکات اور حروفِ علت کی کمی سے پیدا ہوتی تھی، عربی میں تین حرکتیں ہی زبر، زیر اور پیش، اور تین ہی حروفِ علت ہیں واؤ، الف اور یے، حرکات عام طور پر حروف پر نہیں لگائی جاتیں - بلکہ سیاقِ عبارت اور قرینۂ مقام سے پتہ چلتا رہتا ہے کہ یہاں زبر ہے یہاں زیر ہے اور یہاں پیش، جیسا کہ اُردو میں ہوتا ہے۔

حرکات داخلِ تحریر نہ ہونے سے رسم خط در اصل مکمل نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک قسم کی مختصر نویسی یا شارٹ ہینڈ بن جاتا ہے، اور صحیح اور مکمل رسم خط وہ ہے جس میں حرکات اور حروف داخلِ تحریر ہوں، تاکہ غلط پڑھنے کا بالکل امکان باقی نہ رہے - اس کے علاوہ تین حرکات اور تین حروفِ علت ترکی تلفظ کے لئے کافی نہ تھے، ذیل میں ہم مقابلہ کے لئے دونوں زبانوں کے حرکات اور حروفِ علت لکھتے ہیں جس سے آپ کو صحیح اندازہ ہو سکے گا کہ ان کی تعداد اور نوعیت میں کیا فرق ہے۔

ترکی حرکات و حروف علت

۱- زبر	A
۲- زیر اور یائے معروف	İ
۳- پیش اور واؤ معروف	U
۴- زبر اور زیر کے درمیان	E
۵- زیر اور پیش کے درمیان	I
۶- واؤ مجہول اور یائے مجہول کے درمیان	Ö
واؤ معروف اور یائے معروف کے درمیان	Ü
۷- واؤ مجہول	O
۸- الف	Â

عربی حرکات و حروف علت

۱	زبر
۲	زیر
۳	پیش
۴	واؤ معروف
۵	الف
۶	یائے معروف

ایک اور مشکل یہ تھی کہ ترکی میں عربی الفاظ کثرت سے استعمال ہوتے تھے اور اب بھی ہوتے ہیں، اور عربی میں ث، س، ص، ذ، ز، ظ، ض کا علحدہ علحدہ تلفظ ہے لیکن ترکی میں صرف س، اور ز کا تلفظ ہے، لہذا املا درست کرنے میں ترکی تلفظ سے کچھ مدد نہیں مل سکتی تھی، بلکہ رفتہ رفتہ جب بچے کے ذہن میں ہر ایک لفظ کی "صورت شکلی" بیٹھ جاتی تھی تب جا کر وہ کہیں اس قابل ہوتا تھا کہ ثبوت ث سے لکھے، صبر ص سے اور سفیر س سے وعلی ہذا القیاس۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس میں کتنا وقت ضائع ہوتا ہے جیسا کہ ہم کو آئے دن اُردو کی تعلیم میں اس کا تجربہ ہوتا رہتا ہے لہذا عربی رسم خط قایم رہنے کی صورت میں نہ تلفظ املا درست کرنے میں مدد دیتا تھا اور نہ املا تلفظ صحیح کرنے میں۔

رسم خط بدلنے سے ان تمام مشکلات کا یکسر خاتمہ ہو گیا، اب ترکی میں ہر ایک حرکت اور حرف علت کے لئے علحدہ شکل موجود ہے، اور ہر ایک تلفظ کی جو ترکی زبان میں پایا جاتا ہے صحیح ترجمانی ہو سکتی ہے اور اسوقت دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں صرف ترکی زبان ہی ایسی ہے جو تلفظ کے عین مطابق لکھی جاتی ہے۔

رسم خط بدل جانے سے ترکی میں پڑھے لکھے آدمیوں کی تعداد نے اس قدر جلد ترقی کی کہ یا تو ترکی میں صرف ۱۰ فیصدی پڑھے لکھے آدمی پائے جاتے تھے، یا اب صرف ۸ فیصدی جاہلوں کی تعداد رہ گئی ہے کاش اُردو کے علمبرداران ترقی آنکھیں کھولیں اور اپنے رسم خط میں ایسی انقلابی اصلاح کریں جس سے تمام موجودہ مشکلات دور ہو جائیں اور اُردو زبان اپنی ہمسایہ اور حریف زبانوں کے ساتھ ساتھ شاہراہ ترقی پر گامزن ہو سکے، اور یہ کوئی مشکل کام نہیں کہ ہمارے حروف کی شکلیں حتی الامکان قایم رہیں اور صرف

طباعت کے لئے ہمارا خط ایسا مکمل ہو جائے کہ اُس میں وہ تمام آسانیاں پائی جائیں جو رومن حروف میں پائی جاتی ہیں۔ جیسا کہ محمودی رسم خط میں تجویز کیا گیا تھا، یا پھر ہمت کر کے رومن رسم خط ہی اختیار کر لیا جائے جو رفتہ رفتہ دنیا کا بین الاقوامی رسم خط بنتا چلا جا رہا ہے۔ رومن اختیار کرنے سے ایک خاص فایدہ یہ بھی ہوگا کہ اردو کے مخالفین بھی مجبوراً اُردو پڑھنے لگیں گے اس لئے کہ اس وقت تو وہ عناد اور دشمنی کی بنا پر اُردو رسم خط نہیں سیکھتے اور جب وہ ایک عام رسم خط میں لکھی جانے لگی تو وہ اپنی خواہش کے خلاف بھی اُس کو پڑھ ہی لیا کریں گے، اسی طرح اُن تمام قوموں کو بھی اُردو زبان سیکھنے کے لئے رسم خط کا سوال ہی باقی نہیں رہے گا جو محض اجنبی اور پیچیدہ رسم خط کی وجہ سے اُردو سیکھنے کی ہمت نہیں کرتیں۔

اس جملۂ معترضہ کے بعد ہم پھر اپنے اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں، ترکی رسم خط کی تبدیلی کے متعلق اس مختصر گزارش کے بعد اب ہم ترکی کی ابتدائی درسی کتابوں کے متعلق کچھ لکھنا چاہتے ہیں، ترکی میں جو درسی کتابیں ابتدائی مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں وہ زمانۂ حال کی ذہنیت، واقعات اور حالات کے عین مطابق ہیں اُن میں معلومات عامہ، وطن کی محبت، اور قومی تعمیر کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے، وہاں کتابوں میں اب تک یہ نہیں پڑھایا جاتا کہ "ہندوستان میں دیا سلائی کا کارخانہ نہیں" "نہر پر چل رہی ہے پن چکی" "رب کا شکر ادا کر بھائی ― جس نے ہماری گائے بنائی" "دنیا میں سب سے بہتر حکومت وہ ہے جو برطانیہ عظمیٰ کے مثل و مانند ہو"

سمجھانے کا انداز بھی بالکل نرالا اور دلچسپ ہے، ذیل میں ہم دوسری اور تیسری کتاب کے بعض اسباق کا ترجمہ آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں جن سے آپ کو درسی مضامین اور اُسلوب بیان کا کچھ اندازہ ہو جائیگا

تیسری کتاب کا سب سے پہلا سبق اس طرح شروع ہوتا ہے:

"بچو! تمہارا دن مبارک ہو!

میں تم کو دوبارہ دیکھ کر کس قدر خوش ہوں، اس سال ہم (کتاب اور بچہ) بہت اچھے ساتھی ثابت ہونگے تم مجھ سے زیادہ محبت کرو، اب تمہاری آنکھوں میں پہلے کے مقابلہ میں ذہانت اور سمجھ کی زیادہ چمک نظر آتی ہے اب تم زیادہ باتیں جاننے لگے ہو۔ چھٹیوں کا زمانہ بھی تم نے اچھی طرح گزارا ہے، میں تمہارے بڑھنے، طاقتور ہونے، اور علمی مستعدی کو دیکھ کر اور تمہاری تربیت میں اپنے مددگار ہونے کا فخر محسوس کر کے کس قدر خوش ہوں

میں اِس سال تمہارے لئے بہت سی نئی چیزیں لائی ہوں، میں تمہارے سامنے اچھے اچھے خیالات اور دلچسپ قصّے پیش کروں گی، میں تم کو اپنی قومی زبان کی تعلیم دینے میں بھی بڑا فخر محسوس کرتی ہوں، تم اپنی ننھی ننھی کتابوں کی الماری میں مجھے بھی ایک خاص جگہ دو، اور مجھے اچھی طرح سنبھال کر رکھو، جب تم بڑے ہو کر ایک

سمجھدار انسان بن جاؤ گے، تو تمھارے بچپن کا یہ ساتھی اُن پیارے دنوں کی تم کو یاد دلائے گا جو اُس نے تمھارے ساتھ مل کر گزارے ہیں۔

مجھ سے محبت کرو اور اس سال بھی گزشتہ سال کی طرح خوشی خوشی کوشش کئے جاؤ آیندہ سال میں بھی تمھارے ساتھ ساتھ بڑی ہو جاؤں گی، اور تمھارے سامنے بہت سی نئی نئی چیزیں پیش کروں گی۔ اچھا پیارے بچو! آؤ، دیکھیں تم کس طرح محنت کرتے ہو"۔

دوسری کتاب میں "جہاز" پر بچّوں کے لئے ایک نظم ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:-

اپنی چمنی سے کالا دھواں
اُڑاتا ہوا، بھاگتا ہے، بھاگتا ہے
کسی جگہ بغیر رُکے ہوئے
بڑی بڑی موجوں پر سوار ہوتا چلا جاتا ہے
بغیر تھکے ہوئے دور، دور
وسیع سمندروں میں سیدھا چلا جاتا ہے

چاہے کتنے ہی دن گزر جائیں
اُس میں کوئی پست ہمتی پیدا نہیں ہوتی
رات ہو یا دن، سب اُس کے لئے برابر ہیں،
موجیں اُس سے آکر ٹکراتی رہتی ہیں
وہ نہیں ڈرتا، بھنور ہو،
یا طوفان، یہ اُس کو ڈبو نہیں سکتے

ترکی قوم کیا ہے، اس کے متعلق دوسری کتاب میں ایک سبق ہے:-

"ترک دنیا کی عظیم ترین اور بہترین بہادر قوم ہے، ترک ہزاروں برس کی عظمت سے بھری ہوئی تاریخ کے مالک ہیں، یہ وسط ایشیا سے نکلے اور جس جگہ ٹھیرے وہاں ایک بلند تمدن کے آثار چھوڑتے چلے گئے، ترکوں کے اچھے اخلاق کے ذکر سے تاریخیں بھری پڑی ہیں، ہمسایوں سے محبت کرنے، غریبوں کی مدد کرنے اور برائیوں کے روکنے میں وہ ہر قوم سے آگے ہیں، اس حقیقت کو ہر ایک جانتا ہے کہ ہماری قوم کس قدر بہادر اور ہمت والی ہے، مغربی قومیں اگر کسی کی بہادری اور قوت کا اظہار کرنا چاہتی ہیں تو کہتی ہیں "ترکوں کی طرح طاقتور ہے" ترکوں کی سمجھ بھی بڑی تیز ہوتی ہے، اُن کے لئے وطن کی محبت ہر ایک محبت پر مقدم ہے، اُن کی سرزمین پر بُری نگاہ ڈالنے والوں کو تباہ کرنے کے لئے وہ اپنی جان دینے سے کبھی گریز نہیں کرتے"۔

دوسری کتاب میں وطن سے محبت کرنے اور اُس کو دشمنوں سے محفوظ رکھنے کے مضمون کو عجیب دلچسپ پیرایہ میں پیش کیا گیا ہے:-

"ہمارا ایک باغ ہے، بہت اچھا، جس میں طرح طرح کے پھول اور رسیلے پھل پائے جاتے ہیں، یہ باغ ہمارا ہے، ہمارے باپ دادا کا ہے، اس باغ کے آس پاس کانٹوں کی ایک مضبوط باڑ لگی ہوئی ہے، اگر کوئی شخص

بُری نیت سے باغ کے اندر آنا چاہتا ہے تو وہ باڑ اس کو روک دیتی ہے اور وہ اندر نہیں گھس سکتا، اسی طرح ہمارا ایک اور باغ بھی ہے، اس سے بہت بڑا، اُس میں ہر قسم کے درخت ہیں، نہریں ہیں، دریا ہیں، کھیت ہیں، آدمی ہیں، جانور ہیں، یہ باغ ہمارا وطن ہے، اُس کے آس پاس بھی حفاظت کے لئے ایک باڑ لگی ہوئی ہے، توپوں کی، جہازوں کی، ہوائی جہازوں کی، قلعوں کی لیکن سب سے مضبوط قلعہ جو کبھی فتح نہیں ہو سکتا وہ ترک سپاہی کا سینہ ہے۔"

صفائی کے متعلق تیسری کتاب ایک سبق ہے :-

" درختوں کو دیکھو کیسے صاف ہیں، پھولوں کو دیکھو کیسے صاف اور ستھرے ہیں، جانوروں کو دیکھو وہ بھی صاف رہنا ضروری سمجھتے ہیں، پرندوں کو دیکھو کیسے صاف اور چمکدار ہیں، اُن کے پر کیسے ستھرے اور چمکیلے ہیں، تم بھی پرندوں اور پھولوں کی طرح صاف رہو، تمھارا چہرہ صفائی میں تمھارے دل کی طرح ہونا چاہئیے۔ صاف بچوں سے ہر ایک محبت کرتا ہے، گندہ بچوں کو صفائی پسند مائیں پیار نہیں کرتیں۔"

ستاروں کے متعلق باپ اور بیٹے کا مکالمہ :-

باپ ـــ کیا اچھی گرمیوں کی شام ہے، آسمان پر ایک چھوٹا سا ابر کا ٹکڑا بھی نہیں ہے، آؤ بچو باہر باغ میں نکلیں، اور ستاروں کا تماشا دیکھیں، تم نے ستاروں کو ابھی تک اچھی طرح دیکھا بھی ہے۔

بیٹا ـــ دیکھا ہے ابا جان - تمام ستارے ایک طرح نہیں چمکتے بعض بڑے بعض چھوٹے دکھائی دیتے ہیں، کسی کی روشنی پیلی، کسی کی بنفشئی، اور کسی کی سُرخ ہوتی ہے۔

باپ ـــ اس درخت کے اوپر مغرب کی طرف دیکھو، ایک چمکتا ہوا ستارہ نظر آتا ہے ؟ وہ شام کے وقت دن ڈوبتے اس جگہ نظر آتا ہے، اور چرواہوں کو خبر دیتا ہے کہ اب اپنا اپنا گلہ باڑے میں واپس لیجاؤ، اسی لئے اس کو چرواہوں کا ستارہ کہتے ہیں۔

بیٹا ـــ ابا جان، کیا ایک ستارہ ہے جس کا نام لوہے کی میخ ہے ؟

باپ ـــ ہاں میں وہ بھی تمھیں بتاؤں گا، یہ ستارہ رات کو ہر وقت ایک ہی جگہ نظر آتا ہے، اور جو مسافر راستہ بھول جاتے ہیں، اور اسی طرح رات کے وقت جہازوں کو راستہ بتاتا ہے، اور چونکہ وہ اپنی جگہ کبھی نہیں بدلتا اور آسمان میں ایک ہی جگہ میخ کی طرح ٹھکا ہوا نظر آتا ہے، اس لئے اس کو لوہے کی میخ کہتے ہیں۔

بچو ! گرمیوں کی کھلی ہوئی راتوں میں ستاروں کو دیکھا کرو، میں تم کو آہستہ آہستہ ان کے متعلق بتاؤنگا کائنات کس قدر خوبصورت ہے، کتنی وسیع ہے، یہ تم سمجھ جاؤ گے، ان ستاروں میں سے بعض اتنے بڑے بڑے سورج ہیں کہ اُن کی عظمت تمھارے ذہن میں نہیں آسکتی، وہ اس قدر دور واقع ہیں کہ آسمان پر ایک نقطہ

کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔

یہ لاتعداد سورج ہماری دنیا کی طرح بہت سی دنیاؤں کو روشنی پہونچاتے ہیں، اُن دنیاؤں میں سے بعض میں تمھاری طرح اپنے باپ کے ساتھ آسمان کی سیر کرنے والے بچے بھی ہیں۔"

تیسری کتاب میں "صدائے بازگشت" کے عنوان سے ایک سبق ہے:

"ننھا علی صدائے بازگشت کی حقیقت کو نہیں پہچانتا تھا، ایک مرتبہ وہ چراگاہ میں گھوم رہا تھا، اتفاقاً وہ بولا "ہے ہے" سامنے درختوں کے جھنڈ میں سے آواز آئی "ہے ہے"

علی نے یہ خیال کرکے کہ درختوں کے پیچھے کوئی چھپا ہوا ہے، آواز دی:۔

تم کون ہو؟

سامنے سے آواز آئی "تم کون ہو؟ علی نے غصہ میں آکر کہا "تو کوئی بدمعاش ہے" آواز آئی "تو کوئی بدمعاش ہے" اب تو علی کو بہت غصہ آیا اور وہ درختوں میں چھپے ہوئے لڑکے سے جو اُس کے منہ میں آیا کہنے لگا اور اُدھر سے وہی آوازیں آنے لگیں جو اُس کے منہ سے نکلتی تھیں، علی جب کچھ نہ سمجھ سکا تو درختوں کے جھنڈ میں گھس گیا۔ اور اُس سے مذاق کرنے والے لڑکے کو ڈھونڈھنے لگا، لیکن اُسے کوئی بھی نظر نہیں آیا، وہ دوڑا ہوا اپنے گھر آیا اور اپنی ماں کو سارا ماجرا سنایا، وہ ہنسنے لگی اور بولی:۔

"بیٹا تم غلطی کر رہے ہو، تم سے کسی نے بُری بات نہیں کہی، وہ بری باتیں کہنے والے تمھیں ہو اگر تم اچھی باتیں کہتے تو درختوں کے جھنڈ میں سے تمھیں اچھی باتیں سنائی دیتیں، تم جیسا کہوگے ویسا سنوگے"

ترکی میں ایک قومی عید منائی جاتی ہے جس کو عید جمہوریت کہتے ہیں، یہ عید کیا ہے اس کو تیسری کتاب کے ایک سبق میں بچوں کو یوں سمجھایا جاتا ہے:۔

"دمیر ہر سال عید جمہوریت کے دن اپنے باپ کے ساتھ "مارچ پاسٹ" دیکھنے جایا کرتا تھا، فوج کے سپاہی اور بوائے اسکاوٹ جو ہر طرف سُرخ جھنڈے لہراتے تھے وہ بڑی خوشی سے اس کا تماشا دیکھا کرتا تھا، وہ چاہتا تھا کہ یہ خوبصورت اور پیارا دن کبھی ختم نہ ہو، وہ اب تک اس دن کو ایک تفریح کا دن سمجھتے ہوئے اس کا انتظار کیا کرتا تھا۔ اُس نے اپنی عمر کے دسویں سال قدم رکھا ہے، اور وہ اب زیادہ اچھی طرح سمجھنا چاہتا ہے، وہ اس کے متعلق اپنے ماں باپ سے بہت سی باتیں پوچھتا ہے۔

یہ تو میں جانتا ہوں کہ یہ سپاہی اور یہ بوائے اسکاوٹ اپنے پیارے اتاترک کے سامنے سے گزرنے اور اُس کو سلام کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں، لیکن آج ہی کے دن کیوں جمع ہوئے ہیں؟ یہ اُس نے اپنے باپ سے پوچھا، اس سوال کے جواب میں اُس کو یہ باتیں معلوم ہوئیں:۔

"لمبے لمبے قدم اُٹھا کر زمین کو ہلا دینے والے یہ سپاہی اور اپنے دل میں ایک بڑی ہستی کا خیال لئے ہوئے سامنے سے گزرنے والے یہ بوائے اسکاوٹ اور ہر طرف پھولوں کی طرح جھنڈیاں اُڑانے والے اور خوشی سے پھولے نہ سمانے والے یہ شہری لوگ سب اس امر کا اظہار کر رہے ہیں کہ اُن کو اتاترک اعظم سے اپنی جان کی طرح وابستگی ہے۔"

باپ نے آگے چل کر یہ بھی بتایا کہ "آج سے پندرہ بیس سال پہلے ہمارے وطن پر دشمنوں نے حملہ کیا، ہمارے اُس وقت کے بڑے لوگ بہت بُرے تھے اور وہ ہمارا ملک دشمنوں کو دیتے چلے جا رہے تھے، اس بات کو سب سے پہلے اتاترک نے محسوس کیا اور وہ آگے نکلا، اُس کی کوششوں سے ہم نے دشمنوں سے نجات پائی اور اپنے ملک کو اُن سے آزاد کیا، آج سے اکیس سال پہلے ساری قوم نے اتاترک کا انتخاب کیا، اُسی وقت سے اتاترک ہماری جمہوریت کا صدر رہے، اُس کے زمانے میں ہمارے ملک نے بہت ترقی کی، بہت سی نئی چیزیں ہم کو ملیں دیکھو بیٹے! آج جمہوریت کو قایم کرنے اور اتاترک کے صدر بننے کا دن ہے، اس وجہ سے ہمارے ملک میں ہر جگہ عید منائی جا رہی ہے اور قوم بڑی خوشی سے اس دن کو گزار رہی ہے، زندہ باد جمہوریت!"

واضح رہے کہ یہ کتاب اُس زمانہ کی ہے جبکہ اتاترک زندہ تھا، اتاترک کے متعلق اسی کتاب میں بچوں کیلئے ایک چھوٹی سی بحر کی چھوٹی نظم ہے، ملاحظہ فرمایئے:-

۱- اس ترکی کو موت سے
وہی ہے بچانے والا
وہی ہے نئے سرے سے
ترکیت بنانے والا

۲- اُسی کی فوجوں نے
دشمن کو برباد کیا
قوم کو اور وطن کو
اُسی نے آباد کیا

۳- ترکی کی سب امیدیں
ہیں اُسی کی خواہشیں
اور اُسی کا اونچا دل
ترکوں کا ہے بس وطن

۴- اِس وطن کو، ملک کو
اور جمہوریت کو
تو نے ہی سنوار کر
ہم کو ہدیہ کر دیا

۵- ہم کو اونچا کرنے والا
باپ ہمارا تو ہی ہے
تیرے کہنے پر چلتا ہے
دل کا ایماں، دل کا یقین

۶- ملک ترقی کرتا رہے
ترکیت بھی بڑھتی رہے
اتاترک بھی زندہ رہے
جمہوریت کا سردار

ان اقتباسات کے پیش کرنے کا یہ منشا نہیں ہے کہ آپ ان کو اپنی عمر اور اپنے علم و فضل کے معیار پر جانچیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ دوسرے اور تیسرے درجہ میں تعلیم پانے والے بچے کی ذہنیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ترکی میں اُن کے موجودہ معیار تعلیم کا مقابلہ اپنے ملک سے کریں اور دیکھیں کہ قوم کے متحد اور آزاد ہونے سے زندگی کے ہر شعبہ میں کس قدر مفید اور ٹھوس نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

ترک بچہ ابتدا ہی سے ترک ہونے کے فخر کو محسوس کرتا ہے، بچپن ہی سے آزاد ماحول اور آزاد قومی تعلیم سے فایدہ اُٹھاکر اپنے ملک اور قوم کا صحیح فرد ثابت ہوتا ہے۔

ہمارا ارادہ ہے کہ آیندہ کسی فرصت میں اونچے درجوں کی کتابوں کا اقتباس و ترجمہ بھی پیش کریں، جو یقیناً اردو زبان کے لئے بھی ایک مفید خدمت ثابت ہوگی۔

محمود علی خاں

ضرورت رشتہ

کے متعلق جو اعلان پچھلے مہینے نگار میں شایع ہوا تھا، اس کو دیکھ کر بہت سے خطوط موصول ہوئے ہیں، جن میں سے اکثر قابل جواب نہ تھے، اس لئے بعض اُمور کی صراحت ضروری معلوم ہوتی ہے، تاکہ بیکار مراسلت کی نوبت نہ آئے

۱- صرف وہی حضرات خط و کتابت کریں جو حنفی المذہب اور حیدر آباد، دہلی یا یوپی کے باشندے ہوں۔

۲- اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ہی معقول مستقل ملازمت یا معقول ذریعہ آمدنی رکھتے ہوں۔

۳- ناکتخدا ہوں اور عمر ۳۰ سال سے زیادہ نہ ہو۔

۴- مشرقی تہذیب و اخلاق کو پسند کرتے ہوں اور صحیح و توانا ہوں۔

۵- معزز شریف خاندان سے تعلق رکھتے ہوں اور شادی کو محض جنسی تعلق کی چیز نہ سمجھتے ہوں بلکہ اسے سماج کا سنجیدہ فرض یقین کرتے ہوں۔

۶- اپنے مفصل حالات کے ساتھ اپنی تصویر بھی روانہ کریں ــــ جس لڑکی کے لئے رشتہ مطلوب ہے وہ امسال فائنل بی۔ اے میں شریک ہو رہی ہے، پسندیدہ شکل و صورت رکھتی ہے، نہایت سلیقہ مند اور ہوشیار ہے عمر ۲۰ سال ہے اور لکھنؤ کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ لڑکی کی تربیت بالکل مشرقی تہذیب کی ہوئی ہے اور "سوسائٹی گرل" بننا پسند نہیں کرتی۔ رنگ صاف، بدن چھریرا، قد دراز اور نقشہ کتابی ہے۔ تصویر بھی بھیجی جا سکتی ہے اور ابتدائی اُمور طے ہو جانے کے بعد ایک دوسرے کو دیکھ بھی سکتے ہیں۔ خط و کتابت کا پتہ یہ ہے: م۔ ن۔ ذریعہ دفتر نگار۔ لکھنؤ

مالہ وماعلیہ

فروری ۴۶ء کے شاہکار میں جناب جگر مرادآبادی کی ایک غزل شایع ہوئی ہے، جناب جگر کی یہ غزل غالباً اُن کے موجودہ دورِ شاعری کی پیداوار ہے اور اسی لئے ہم اسکی داد زیادہ سے زیادہ یہی دے سکتے ہیں کہ اشعار ناموزوں نہیں ہیں۔ بے کیفی اور پھیکا پن بجائے خود غزل کا بہت بڑا عیب ہے چہ جائیکہ اس میں اغلاط بھی ہوں۔

ہم نے دُنیا ہی میں دُنیا کی حقیقت دیکھی ۔۔۔ یہیں دوزخ نظر آئی یہیں جنت دیکھی
عشق کے بھیس میں جب حُسن کی صورت دیکھی ۔۔۔ ہر ادا پھر تو قیامت ہی قیامت دیکھی
منفرد رنج نہ تنہا کوئی راحت دیکھی ۔۔۔ یہ تری نیم نگاہی کی شرارت دیکھی
جب تجھے دیکھ کے کونین کی وسعت دیکھی ۔۔۔ حُسن ہی حُسن محبت ہی محبت دیکھی
اُس گنہگارِ محبت کو خدا ہی سمجھے ۔۔۔ جس نے ظالم تری آنکھوں کی ندامت دیکھی
نگہِ شوق کی محرومیٔ تقدیر نہ پُوچھ ۔۔۔ بن گئی وہ بھی فسانہ جو حقیقت دیکھی

حُسنِ بے نام نے رکھا تھا چھپا کر جس کو
وہ تجلی بھی سرِ پردۂ حیرت دیکھی

۱۔ پہلا مطلع بالکل بے معنی ہے۔ شاعر غالباً یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ دوزخ وجنت انسان کو دنیا ہی میں ملجاتی ہے لیکن وہ اس مفہوم کو اچھی طرح ظاہر نہ کر سکا ۔۔ اگر دونوں مصرعے ایک دوسرے سے مربوط ومتعلق ہیں تو یقیناً دوسرا مصرعہ اور "دنیا کی حقیقت" کو ایک ہی چیز ماننا پڑے گا، حالانکہ "دوزخ وجنت" نہ دُنیا کی چیزیں ہیں اور نہ دُنیا کی حقیقت سے انھیں کوئی واسطہ۔ "دوزخ وجنت" عقبیٰ کی چیزیں ہیں، آخرت کی حقیقتیں ہیں نہ کہ دنیا کی۔ دُنیا کو مذہب کی زبان میں دار العمل، تصوف کی دنیا میں گزشتنی وگزاشتنی اور شعر وشاعری میں محض حسرت کدہ کہا جاتا ہے۔ دوزخ وجنت سے اسے کوئی واسطہ نہیں، اس لئے اس نظریہ کی بنا پر اگر دوسرا مصرعہ یوں ہو:

ہم نے دُنیا ہی میں عقبیٰ کی حقیقت دیکھی

تو خیر، مفہوم پیدا ہو سکتا تھا۔ لیکن اگر مقصود اس نظریہ سے انکار تھا تو پھر پہلا مصرعہ یوں ہونا چاہئے تھا:

عاقبت کچھ نہیں، جو کچھ ہے یہی دُنیا ہے

۲۔ دوسرا مطلع بے معنی تو نہیں لیکن غلط ضرور ہے۔ شاعر کا مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ جب حُسن خود مبتلائے عشق

ہوجاتا ہے تو اس کی ہر ادا قیامت ہوجاتی ہے۔ لیکن شاعر غالباً اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا کہ اگر حُسن مبتلائے محبت نہ ہو تو کیا اُسکی ادا قیامت سے کم ہوتی ہے۔ لیکن خیر، اس کو چھوڑئے۔ پہلا مصرعہ اس مفہوم کے لحاظ سے بھی کمزور وسقیم ہے۔ اول تو "بھبیں" کا استعمال یہاں صحیح نہیں، کیونکہ بھبیں کا تعلق نمایش سے ہے نہ کہ حقیقت سے حالانکہ شاعر کا مقصود اُسے واقعی مبتلائے محبت ظاہر کرنا ہے۔ دوسرے یہ کہ "صورت" کی تعیین بالکل غیر ضروری بلکہ غلط ہے، "حُسن مجرد" صورت سے بے نیاز ہے، صرف یہ کہنا کافی تھا کہ "حُسن کو دیکھا میں نے"

۳- اس شعر میں منفرد غزل کا لفظ نہیں۔ علاوہ اس کے "رنج وراحت" — "سکون واضطراب" کی جگہ استعمال کئے گئے ہیں اور اسی لئے پہلا مصرعہ غزل کی حدود سے نکل کر مسجد وخانقاہ کی چیز ہوگیا۔

۴- یہ شعر غالباً تصوف کے رنگ کا ہے، لیکن ناقص وناتمام "تجھے دیکھنے کے بعد کونین کی وسعت" دیکھنا کوئی مفہوم نہیں رکھتا، کیونکہ حُسن ہی حُسن یا محبت ہی محبت دیکھنا کونین کی وسعت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اگر یہ کہا جاتا کہ تجھے دیکھنے کے بعد جدھر نگاہ گئی، حُسن ہی حُسن نظر آیا، محبت ہی محبت دیکھی تو بیشک درست ہوسکتا تھا۔ کونین کی وسعت دیکھنے کا اظہار یہاں بالکل بیکار ہے۔ علاوہ اس کے دوسرے مصرعہ کے پہلے ٹکڑے کے لئے فعل مذکر ہونا چاہئے لیکن اسکو بھی دیکھی ہی کے ساتھ مربوط کر دیا گیا۔

۵- پہلے مصرعہ میں بجائے "کو" کے "سے" چاہئے۔ محاورہ غالباً یہ ہے "اُس سے خدا سمجھے" ——— دوسرے مصرعہ میں لفظ ظالم بالکل زاید ہے لیکن اگر کہا جائے کہ اس لفظ سے محبوب کو مخاطب کیا گیا ہے تو بھی صحیح نہیں، کیونکہ جب محبوب کی آنکھوں میں ندامت ہوگی تو اسے ظالم کیونکر کہیں گے اور اگر اس کی ندامت کو بھی اس کا ظلم ہی ظاہر کرنا ہے تو پھر ——— "گناہگار محبت کو خدا کیوں سمجھے"

۶- پہلے مصرعہ میں تقدیر کا استعمال بالکل زاید وبے محل ہے "نگہ شوق کی محرومی" کہنا کافی تھا۔ "نگہ شوق کی تقدیر کی محرومی" کیا؟

۷- معلوم نہیں جگر صاحب نے دوسرے مصرعہ میں "سراپردۂ حیرت" نظم کیا ہے یا "سر پردۂ حیرت"۔ اگر "سراپردۂ حیرت" نظم کیا ہے تو تجلی کا "سراپردۂ حیرت" ہونا کوئی مفہوم کھینچ تان کے پیدا کیا جائے تو دیکھی کی جگہ نکلی ہونا چاہئے۔ دیکھنے کے ساتھ صحیح انداز بیان یوں ہونا چاہئے کہ "اُس تجلی کو بھی سراپردۂ حیرت دیکھا"۔ لیکن اگر یہ "سر پردۂ حیرت" ہے (اور غالباً یہی ہے) تو پھر سر میں اظہار اضافت مناسب نہیں۔ "سر پردہ" کہنا چاہئے۔ اور یہ غلطی اسی قسم کی ہے جیسے اکثر حضرات بجائے سَر ورق کے سرِ ورق لکھتے بولتے ہیں۔ سر اظہار اضافت کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے لیکن اسی وقت جب کنارہ یا فکر وخیال کے معنے میں آئے۔ عنوان یا ابتدا وآغاز کے مفہوم میں ہمیشہ فکر اضافت کے ساتھ اسکا استعمال ہوتا ہے۔

علاوہ اس کے وہ سراپردہ ہو یا سر پردہ، شعر مفہوم سے بے نیاز ہے۔ حیرت تو پردۂ تجلی ہوسکتی ہے لیکن تجلی، حیرت کا پردہ نہیں ہوسکتی۔

باب لاستفسار

ہندی اور عربی ہندسے

(جناب سید ح - ا - لشکر)

مکرمی — چند سطریں مستفسرانہ طریق پر ارسال خدمت ہیں - کہہ نہیں سکتا کہ آپ کی معلومات کے اعتبار سے یہ کسی مصرف کی ہیں یا نہیں - اگر ہوں تو کام میں لائی جا سکتی ہیں -

چند روز ہوئے کہ دہلی ریڈیو سے ایک مختصر مضمون اعداد سے متعلق نشر ہوا تھا جس میں یہ ظاہر کیا گیا کہ ہندسے (اعداد - ۱ - ۲ - ۳ - وغیرہ) ہندوستان میں سنہ عیسوی سے تین چار سو برس بیشتر ایجاد ہوئے تھے اور یہاں سے اہل عرب نے حاصل کرکے یورپ میں پہونچائے - اس قول کے اعتبار سے کہ پہلی مرتبہ یہ ہندسے اشوک کی لاٹوں پر پائے جاتے ہیں، بظاہر یہ نظریہ درست معلوم ہوتا ہے مگر پھر بھی ایک خلش سی باقی رہتی ہے -

اسوقت تک محققین کے نزدیک یہ امر مسلم ہے کہ جو حروف سامی اقوام نے کئی ہزار سال قبل سنِ عیسوی ایجاد کئے تھے وہی عراق کے توسط سے سنِ عیسوی سے سات آٹھ سو سال قبل ہندوستان میں پہونچے تھے جہاں قدیم اہلِ ہند نے اُن کو اپنے طور پر ایک عرصۂ دراز میں مرتب و مکمل کرکے اُن میں اضافہ بھی کیا -

عراق میں سنہ عیسوی سے تین چار ہزار برس بیشتر وہی زبان رائج تھی جس سے عبرانی و عربی زبانیں ماخوذ ہیں یا متحد ہیں اُس زمانہ کی عراقی مکتوبات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ الفاظ جن سے شمار کیا جاتا تھا عراقی زبان میں وہی تھے جو عربی زبان میں اب بھی موجود ہیں - مثلاً اربع بمعنی چار - خمس بمعنی پانچ - وغیرہ وغیرہ

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تجارت کے سلسلہ میں عراقی حروف ہندوستان پہونچے تھے اور اس کی دلیل یہ بیان کیجاتی ہے کہ ہندوستانی حروف عراقی باٹوں (پیمانۂ وزن) کے حروف سے ماخوذ ہیں - ظاہر ہے کہ گنتی یا شمار تجارت کا ایک اہم جزو ہے -

بحالاتِ صدر کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ الفاظِ شمار یا اُن کی علامات بھی حروف تہجی کی طرح ہندوستان پہونچی ہوں ؟

اس امکان کی تائید میں وجوہِ ذیل قابلِ غور معلوم ہوتی ہیں - عربی الفاظ شمار یہ ہیں :-

احد - اثنا - ثلث - اربع - خمس - ستہ - سبعہ - ثمن - تسعہ - عشر -

الفاظِ مذکور کی جگہ جب ہندسے لکھے جاتے ہیں تو رومی اعداد کے طرز پر اس طرح لکھے جاتے ہیں :-

عد - ح - ے - للعہ - صمہ - سے - معہ - ہیہ - لعہ - عہ -

ان کے مقابلہ میں ہندی ہندسے اس طرح پر ہیں :-

१ - २ - ३ - ४ - ५ - ६ - ७ - ८ - ९ - १० -

یہ امر ثابت شدہ ہے کہ جب حروف ہندوستان پہونچے تھے تو دائیں طرف سے بائیں جانب لکھے جاتے تھے اور یہی طرز بیان جاری ہوئی اور عرصہ تک جاری رہی لیکن بعد میں کتابت کا طریقہ بدل دیا گیا اور حروف بائیں طرف سے دائیں جانب لکھے جانے لگے - ظاہر ہے کہ اس تبدیلی کا بہت بڑا اثر حروف کی اشکال پر پڑنا چاہئے اور پڑا بھی - چنانچہ سامی اور ہندی حروف میں بالکل مغائرت ہوگئی اور مروجہ ہندی حروف یکسر علٰحدہ شکل کے ہوگئے - مثلاً حرف 'ب' سامی زبان میں 'بیت' سے ماخوذ ہے اور گھر کی چھت اور دیوار کی نمایندگی کرتا ہے - اسوقت کون کہہ سکتا ہے کہ ہندی کا حرف 'ب' بھی سقف و دیوار کی نمایندگی کرتا ہے اور محض اُلٹی جانب سے لکھے جانے کی وجہ سے اُس کی چھت اور دیواریں خمیدہ ہوگئی ہیں - حرف جیم (ج) اونٹ کی گردن کی تصویر ہے - ہندی شکل اُسکی 'ج' ہے - اس کی الف کی شکل کی ماترا اُڑا دی جائے اور بائیں جانب سے لکھا جائے تو جو فرق اسوقت نظر آتا ہے وہ صاف طور پر طرزِ کتابت کی وجہ سے پیدا ہو جانا ظاہر ہوگا - اسی طرزِ کتابت کی بدولت 'T' اور 'ح' ہندی حروف بھی 'د' اور 'ر' کی منعکس شکلوں میں نظر آئیں گے -

اسی نہج پر اگر سامی الفاظ شمار پر نظر ڈالی جائے گی تو ان میں اور اعداد مروجۂ حال میں بہت مماثلت پائی جائگی مثلاً عربی میں لفظ 'احد' کا ہندسہ 'الف' کو حذف کرکے 'عہ' کی شکل میں ظاہر ہوا ہے - اسی 'عہ' کو یا لفظ 'احد' کو اُس کا 'الف' حذف کرکے بائیں جانب سے لکھنے کی کوشش کی جائے تو وہی شکل پیدا ہو جائے گی جو ہندی کے '१' کے ہندسہ کی ہے - خواہ سیدھی طرف سے لکھا جائے یا بائیں طرف سے - لفظ 'حد' لکھنے میں قلم اُسی مقام سے چلنا شروع ہوگا - فرق صرف یہ ہوگا کہ سیدھی طرف سے لکھنے میں 'ح' کی شکل کے بعد قلم اوپر کی طرف یا سامنے سیدھی طرف آسانی سے چلے گا لیکن اُلٹی طرف لکھنے میں قلم نیچے کی طرف سیدھا یا کسی قدر ترچھے پن کے ساتھ یا اُلٹی طرف خطِ مستقیم میں روانی کے ساتھ چلیگا -

ایک اور لفظ 'خمس' دیکھئے - اس کی مخفف شکل عربی میں 'صمہ' کا ہندسہ ہے - ہندی میں پانچ کے ہندسہ کی شکل '५' ہے - 'خمس'، 'صمہ'، اور '५' میں صرف اس قدر فرق پایا جاتا ہے کہ 'خمس' کی 'ح' کی کچھ صورت

بدل گئی ہے اور اس خفیف تبدیلی کا باعث وہی یعنی نئی طرز تحریر قرار دیجا سکتی ہے۔

اسی طرح بلکہ کچھ زاید لفظ 'عشر' کی کیفیت ہے۔ اس کی مختصر شکل 'عــ' کے ہندسہ سے ظاہر کی جاتی ہے۔ مزید بات یہ ہے کہ اُس میں 'صفر' کی علامت بھی پائی جاتی ہے۔ اگر اُس کو بائیں جانب سے لکھا جائے تو ہندی کی لیٹواں تحریر میں '۱۰' کی شکل ہوجائے گی اور 'صفر' 'ایک' کے ہندسہ کے بعد جگہ پائے گا۔

غرضکہ سب الفاظ شمار کی کیفیت اسی نہج پر پائی جاتی ہے۔ بعض الفاظ میں تبدیلیاں بہت سریع الفہم ہیں مثلاً لفظ 'ثلث'۔ یا اُس کا عربی ہندسہ 'ــ'۔ ان کا مقابلہ ہندی ہندسہ '۳' یا '३' سے کیا جائے۔ ہندی ہندسہ '३' میں 'ثلث' کی دوسری 'ث' صرف ایسے شوشہ کی صورت اختیار کرلیتی ہے جو نیچے کی طرف بائیں سمت جھکی ہوئی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اِس شوشہ کے جھکاؤ اور خود اِس ہندسہ کے ترچھے پن کا باعث وہی بائیں طرف سے سیدھی طرف لکھنے کی طرز تحریر ہے۔ 'ــ' کی رقم اور ہندسہ '۲' میں 'ــ' کی رقم اور ہندی کے 'ح' میں بھی اسی قسم کی مماثلت عیاں ہے۔

یہ نظریہ کہ ہندی ہندسے سامی الفاظ یا علامات سے ماخوذ ہیں یا اُن کی بدلی ہوئی شکلیں ہیں کسی یقین کے ساتھ پیش کیا جاسکتا تھا اگر امور مندرجۂ ذیل سے عدم واقفیت اس کی مانع نہ ہوتی:

(۱) قدیم عراقی اور عربی حرف اور الفاظ شمار کی شکلیں۔ (۲) قدیم عراقی زبان میں اعداد کس طرح ظاہر کئے جاتے تھے۔ (۳) لفظ 'عدد' اگر قدیم ہے تو اُس سے کیا مراد تھی اور الفاظ 'ہندسہ' یا 'مہندس' (جو یقیناً ہندوستان سے متعلق ہیں) لفظ 'عدد' کے مقابلہ میں کیا معنی رکھتے ہیں۔ (۴) عربی الفاظ شمار کی مخفف شکلیں (عہ۔ عــ۔ وغیرہ) ہندسوں کی طرز پر کب سے رایج ہوئیں۔

اخیر میں اس قدر گزارش کرنی اور باقی ہے کہ یہ امر ضروری نہیں کہ اگر کسی غیر زبان کے لفظ کو اپنی کتابت میں شامل کرلیا جائے تو اُس کا تلفظ بھی غیر زبان کے طریق پر کیا جائے۔ ممکن ہے کہ ویسا لفظ محض علامت کے طور پر مانا جاتا ہو۔ مثلاً اگر عربی لفظ 'ثلث' کو تین کے عدد کی علامت کے طور پر کتابت میں قبول کرلیا جائے تو یہ ضرور نہیں کہ اُس کو عربی طریق پر پڑھا بھی جائے بلکہ پڑھتے وقت اُس کو 'تین' پڑھا جاسکتا ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ایسی طرز تحریر ایران میں کسی زمانۂ قدیم میں رایج تھی جبکہ پارسی زبان پہلوی خط میں لکھی جاتی تھی۔ اُس طرز تحریر کی خصوصیت یہ تھی کہ پہلوی حروف کی کتابت میں پارسی الفاظ کے ساتھ سامی الفاظ لکھے جاتے تھے لیکن جب عبارت کے پڑھنے کی نوبت آتی تھی تو سامی لفظ کے بجائے پارسی لفظ پڑھا جاتا تھا مثلاً کتابت میں 'ملکان ملک' لکھا جاتا تھا لیکن پڑھتے وقت یہ "شاہان شاہ" پڑھا جاتا تھا۔ اس لئے یہ تعجب کی بات نہیں ہوسکتی کہ جب ہندوستان میں سامی حروف آئے تو اُن کے ساتھ گنتی (شمار) کے الفاظ بھی بطور علامت

کے قبول کرلئے گئے۔

ممکن ہے کہ نگار یا نگار کے ناظرین میں سے کوئی صاحب اس مسئلہ پر مزید روشنی ڈال سکیں۔

(نگار) آپ کا استفسار بہت دلچسپ ہے۔ گو میں نے ریڈیو کی اس تقریر کو نہیں سنا جس کا حوالہ آپ نے دیا ہے، لیکن آپ کے ایراد و استدراک سے پتہ چلتا ہے کہ اُس تقریر کا موضوع یہ تھا کہ عربی ہندسے، ہندی ہندسوں سے ماخوذ نہیں، حالانکہ آپ کے نزدیک اس کا بھی امکان (اور شاید قوی امکان) ہے کہ ہندوستان میں یہ ہندسے عرب سے آئے ہوں۔

قبل اس سے کہ اصل موضوع پر اظہار خیال کیا جائے، اس امر کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ عربوں کے یہاں عدد اور ہندسہ میں کیا فرق تھا۔

عدد کی تعریف عرب مصنفین نے کئی طرح کی ہے، لیکن سب سے زیادہ وسیع تعریف یہ ہے:

"الواحد و مایتحصل منہ بالتقسیم والتکرار او بترکیبہا" - یعنی عدد سے مراد واحد یا وحدت (Unity) ہے اور اس کی ہر وہ صورت جو اس کی تقسیم، تکرار یا ان دونوں کی ترکیب سے پیدا ہو۔ اس نظریہ کی رو سے ایک (۱) اور اس کے اجزا ریا کسور سب عدد میں شامل ہیں۔ لیکن خود ایک (۱) کے متعلق عرب کے اکثر ریاضی دانوں کا خیال یہی ہے کہ وہ کوئی عدد نہیں ہے۔ یعنی اعداد میں اس کی حیثیت وہی ہے جو مادہ کے مقابلہ میں "جوہر فرد" کی ہے۔

عدد کی دو تعریفیں اور بھی کی گئی ہیں مثلاً ایک یہ کہ "کُل عددٍ نصفُ مجموعِ حاشیتیہا" یعنی ہر عدد اپنے اگلے اور پچھلے عدد کے مجموعہ کا نصف ہوتا ہے۔ ایک اور تعریف یہ کی گئی ہے کہ "عدد نام اُس مقدار یا کمیت کا ہے جو وحدتوں سے ملکر بنتی ہے" (الکمیۃ المتالفۃ من الواحدات) علامہ زمخشری نے لکھا ہے کہ عربی زبان میں صرف بارہ اعداد ایسے ہیں جن کا کوئی نام ہے (ایک سے ۱۰ تک - ۱۰۰ اور ۱۰۰۰) باقی سب انہیں سے ترکیب دیکر بنائے جاتے ہیں۔ الغرض ان تمام بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کے یہاں قرن اول بجائے اعداد کے "اسماء اعداد" کا زیادہ رواج تھا اور صورت و نقش کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ اعداد کو حروف (ابجد - ہوز - حطی - کلمن - سعفص - قرشت - ثخذ - ضظغ) کی صورت میں ظاہر کرتے تھے۔ جو قدیم سامی و یونانی طریقہ تھا۔

ہندسہ، عربی میں جیامیٹری یا اقلیدس کو کہتے ہیں، جو ریاضی کی ایک شاخ ہے۔ لفظ ہندسہ کو ہندوستان سے ماخوذ سمجھنا درست نہیں (جیسا آپ نے قیاس کیا ہے) بلکہ یہ، فارسی لفظ انداختن یا اندازیدن سے ماخوذ

ہے اور اندازہ سے ہندسہ بنا ہے۔

اب رہا اصل سوال کہ الفاظ شمار و علامات شمار، عرب نے ہندوستان سے لئے یا ہندوستان نے عرب سے سو اس باب میں امر اول تو یقیناً قابل بحث نہیں کیونکہ "الفاظ شمار" عرب اور ہندوستان کے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور ان کے متعلق یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ایک دوسرے سے ماخوذ ہیں، البتہ "علامات شمار" کی بابت بحث ہوسکتی ہے اور غالباً یہی اصل موضوع گفتگو ہے۔

اس بحث میں سب سے پہلے اُصولاً ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ خود عرب کے مصنفین و ریاضی داں کیا کہتے ہیں۔ محمد ابن موسیٰ خوارزمی، عہد عباسیہ کے دور زریں کا بہت بڑا ریاضی داں تھا اور عرب میں سب سے پہلا یہی شخص تھا جس نے مشرق و مغرب کی قدیم ریاضی سے فایدہ اُٹھایا۔ اس نے صاف صاف اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ "علامات شمار" عربوں نے ہندوؤں سے حاصل کئے" اور اس کے بعد کے مصنفین نے بھی علم حساب کو ہمیشہ "علم ہندی" کہا۔

ابوریحان بیرونی، جس نے ہندوستان میں کافی زمانہ بسر کیا تھا اور جو خود بھی بڑا زبردست ماہر ریاضی تھا، لکھتا ہے کہ "جس وقت میں ہندوستان آیا (آخری دسویں صدی عیسوی) تو عربوں کی طرح یہاں علامات شمار ظاہر کرنے کے لئے حروف کا استعمال نہ ہوتا تھا اور ہندسے جسے ہندو "انک" کہتے ہیں، ہندوستان کے مختلف حصوں میں مختلف ہیں"۔

بیرونی سے قبل ایک اور عرب مصنف مطہر ابن طاہر (ابتدائی دسویں صدی) نے اپنی تصنیف "کتاب الخلق" میں بہت حیرت کے ساتھ ناگری ہندسوں کا ذکر کیا ہے۔ اس پر ہوارٹ ( ) پورے یقین کے ساتھ یہ حکم لگاتا ہے کہ مطہر کے زمانہ میں عربی کے موجودہ ہندسے استعمال میں نہ تھے اور ہندوستانی ہندسے ہر چند علماء ریاضی کو معلوم تو تھے لیکن رائج نہ ہوئے تھے۔

المسعودی جو مشہور سیاح تھا "مروج الذہب" میں ہندوؤں کے علم "سدھانت" کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "خلیفہ المنصور کے حکم سے اس فن کی متعدد کتابیں عربی میں منتقل کی گئیں" اور سدھانت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "اس کا تعلق نجوم اور علم حساب سے ہے۔

الکندی (ابتدائی نویں صدی) نے ریاضی میں متعدد کتابیں لکھیں، جن میں چار ہندوستانی طریق حساب سے متعلق تھیں اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوؤں میں ہندسوں کا رواج بہت پہلے سے پایا جاتا تھا اور یہ ہندسے عربوں کے علامات شمار سے مختلف تھے۔

الغرض ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے مصنفین ہندوستانی ہندسوں کے تقدم کے قایل تھے

جس کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ عربی میں پہلے صفر نہ تھا اور لفظ صفر لفظی ترجمہ ہے ہندی سونیا کا۔ لیکن اُسکی صورت عربوں نے بدل دی، ہندی میں صفر گول دائرہ کی طرح (٥) لکھا جاتا ہے[1]، اور چونکہ اس کی شکل عربی ہندسہ پانچ کی سی تھی اس لئے انھوں نے اس کی جگہ صرف نقطہ (٠) اختیار کیا۔

اس سلسلہ میں ایک امر اور غور طلب ہے، وہ یہ کہ جس وقت ہندی ریاضی کی کتابیں، عربی میں منتقل ہوئیں اس وقت عربوں میں ہندسے رائج تھے یا نہیں اور تھے تو کس طرح کے۔ نیز یہ کہ اول اول انھوں نے کہاں سے لئے۔ اس باب میں جدید تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ ممکن ہے ہندوستانی ہندسے، شام میں اس سے قبل پہونچ چکے ہوں اور وہاں سے عربوں نے لئے ہوں اور اس کا بھی امکان ہے کہ اموی فاتحین شمالی افریقہ اور ہسپانیہ سے غباری ہندسے اپنے ساتھ لائے ہوں، اور نئے ہندسوں کے رواج سے قبل عرب میں وہی ہندسے وہاں رائج ہوں ہسپانیہ کے ہندسوں کو "حروف الغبار" کہتے تھے اور حروف کے ذریعہ سے طریق شمار کو "حروف الجمل" ——

غباری ہندسوں کا یہ نام اس لئے پڑا کہ اس کے موجد کی عادت تھی کہ وہ تختی پر ریت بچھا کر ہندسے لکھا کرتا تھا۔ ان کی صورت یہ تھی[2]:۔

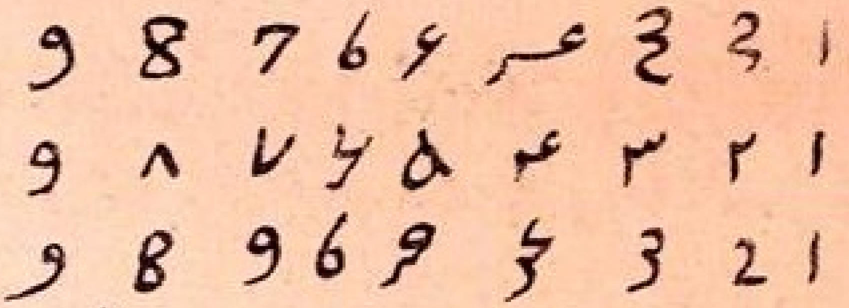

ان ہندسوں کی شکلوں سے پتہ چلتا ہے کہ موجودہ ہندی، عربی اور انگریزی ہندسوں سے یہ کس قدر مماثل ہیں۔ اور ایک قدیم ہسپانوی نصف غباری ہندسوں کا ماخذ بھی ہندوستانی ہندسوں کو قرار دیتا ہے۔

بہر حال اس میں شک نہیں کہ آٹھویں صدی عیسوی میں جب سدھانت کے ترجمہ کے ساتھ ساتھ ہندوستانی ہندسے عرب پہونچے، تو غباری ہندسوں سے بھی لوگ واقف تھے اور "حروف الجمل" (یعنی ابجد) کا طریق شمار بھی رائج تھا۔ لیکن اگر غباری ہندسے بھی واقعی ہندوستانی ہندسوں سے ماخوذ تھے، تو پھر یوں بھی عرب کے ہندسے متقدم العہد نہ سمجھے جائیں گے۔

---

[1] صفر کا رواج سب سے پہلے کب اور کہاں ہوا۔ اس کا موجد ہندوستان ہے یا کوئی اور ملک مستقل بحث چاہتا ہے، لیکن جدید تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں بھی صفر کا وجود پانچویں صدی عیسوی سے قبل نہ پایا جاتا تھا۔

[2] The Hindu Arabic numerals by David Eugene Smith + Louis Charles Karpinski

اس سلسلہ میں ایک بات یہ بھی دیکھنے کی ہے کہ خود ہندوستان میں ہندسوں کا رواج کب ہوا اور اسکی ابتدا کیونکر ہوئی لیکن چونکہ قدیم ہند کی تاریخ بہت تاریکی میں ہے اور ہمارا ذریعۂ علم اصنامی روایات کے علاوہ اور کچھ نہیں، اسلئے یقین کے ساتھ کوئی حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ تاہم آثاری تحقیقات کی بنا پر اتنا کہا جاسکتا ہے (گو زیادہ وثوق کے ساتھ نہیں) کہ چوتھی صدی قبل مسیح سے پہلے یہاں تحریر کا رواج نہیں پایا جاتا تھا اور شمار کا حساب لکڑیوں کے ٹکڑوں، کوڑیوں، کنکریوں، دھاگے کی گرہوں، یا ریت بچھاکر تختوں پر لکیروں کے ذریعہ سے کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد جو نقوش اعداد پائے گئے ہیں ان کی تین قسمیں ہیں، ایک کھروشتی، دوسرے براہمی اور تیسرے حروف والفاظ کی صورت میں — قسم اول کے نشانات مشرقی افغانستان اور شمالی پنجاب میں ملتے ہیں (جو قدیم زمانہ میں گندھارا کہلاتا تھا)۔ اس زمانہ کے حروف تہجی کے نقوش بھی ملتے ہیں جو چوتھی اور تیسری صدی قبل مسیح کے درمیان رائج تھے اور چونکہ یہ داہنے طرف سے لکھے جاتے تھے اس لئے غالباً ان کی اصل سامی زبان تھی۔

نشان اعداد کے لئے کھروشتی میں ہم کو صرف چار نشان (ایک، دو، چار، اور پانچ کے لئے) ملتے ہیں اور یہ صرف کھڑی لکیریں ہیں :—

ا اا اااا ااااا

اس کے بعد پہلی صدی قبل مسیح تک کچھ اور ترقی ہوئی مثلاً

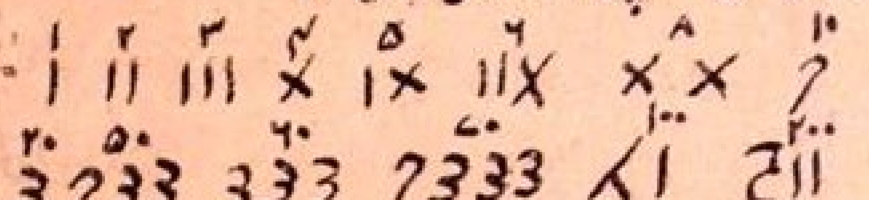

کروستھی نقوش کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ ناگری ہندسوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ براہمی نقوش اور عہد اسوک کے نقوش اعداد کا بھی یہی حال ہے — اس میں شک نہیں کہ قدیم ہند میں بھی اعداد کا شمار زیادہ تر حروف والفاظ کے ذریعہ سے ہوتا تھا، جیسا کہ عرب میں رائج تھا اور جس کو "حروف الجمل" کا حساب کہتے ہیں۔ ہندسوں کا رواج بہت بعد کو ہوا ہے اور ممکن ہے کہ ان کی ساخت میں کچھ چینی اثرات بھی شامل ہوں — ریاضی کا علم تو ہندوؤں کے یہاں بہت قدیم ہے، لیکن ہندسوں اور نقوش اعداد کا رواج ان میں بہت بعد کو ہوا اور گیارھویں صدی عیسوی میں جاکر انھوں نے یہ صورت اختیار کی :—

افسوس ہے کہ میں اس مسئلہ پر فی الحال زیادہ وقت نہیں دے سکتا، ممکن ہے آئندہ کسی وقت زیادہ تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کرسکوں لیکن اسوقت تک میں اسی نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ عربی ہندسے اگر براہ راست ہندوستان سے نہیں پہونچے تو اس سے متاثر ضرور ہوئے اور اس کا امکان بہت ضعیف ہے کہ ہندوؤں نے اپنے ہندسے عربی ہندسوں سے لئے ہوں۔

بوڑھا کسان

دن ڈھلے، پردیسیوں کے گیت پنگھٹ پر نہ تھے
بھیگتے بازو نہ تھے، چھلکے ہوئے گاگر نہ تھے

آ چکی تھیں دخترانِ کوہ و صحرا اپنے گھر
گا چکے تھے گیت چرواہے ہوا کے ساز پر

بھولے بھٹکے قافلوں کی رہگذاروں کے چراغ
دور افق پر جھلملاتے تھے ستاروں کے چراغ

وادیاں کھوئے ہوئے تھیں دور تک شانوں پہ بال
ظلمتیں پگڈنڈیوں پر بُن رہی تھیں اپنا جال،

کھل چکے تھے کالے کالے بادلوں کے بادباں
چرخ کا سیمیں سفینہ تھا اندھیرے میں رواں

پھیلتے جاتے تھے کھیتوں پر تھپیڑے رات کے
ڈوبتے جاتے تھے کچے راستے دیہات کے،

ناگہاں اک شخص یوں آیا نظر صرفِ خرام
لے رہا تھا جس کے سورج سے اندھیرا انتقام

کھو چکی تھی جسکی پیری ٹھوکریں کھانے کی تاب
جس کا چلنا تھا قیامت جس کا گرنا تھا عذاب

ڈگمگاتی ایک میت، لڑکھڑاتی ایک لاش
جس کے ہر احساس پر بیتے زمانوں کی خراش

گر چکا تھا جو پتنگوں کی نظر سے وہ چراغ
جس کو ہونٹھوں سے لگا کر پھینک دیں ایسا ایاغ

ایک سمجھوتہ ہنسی اور آنسوؤں کے درمیاں
اپنے مستقبل کی ذلت، اپنے ماضی کی فغاں

صبح کا اک ماتمی، اک چاندنی کا سوگوار
سانس لیتی ایک تربت، چلتا پھرتا اک مزار

نبض ڈوبی، دل فسردہ، حوصلے چھوٹے ہوئے
ایک ایسا ساز جس کے تار سب ٹوٹے ہوئے

مجھ سے کہتا تھا سُنا ہے اختتامِ جنگ پر
لوٹ کر آتے ہیں میداں سے سپاہی اپنے گھر

موت کو بیچا ہے میں نے سیکڑوں صبحوں کا نور
اپنی فصلوں کی امانت، اپنے کھیتوں کا غرور

ایک مادر کا کلیجا، ایک بیوی کا سہاگ
ایک دریا کا کنارہ اور اک شعلے کی آگ

ایک بچی کا تبسم، جس کے سر سایہ نہیں،
ایک ایسا پھول ہنسنا تک جسے آیا نہیں،

گولیوں کے دام گھر کی ساری دولت بیچ دی
میں نے تاریکی میں آنکھوں کی بصارت بیچ دی

دیکھتے ہو راستوں پر کس قدر اندھیر ہے
صبح ہونے کے لئے اب اور کتنی دیر ہے؟

پروفیسر شور (علیگ)

آں کہ من دانم

ادا بخشِ دو عالم یک ادائے آں کہ من دانم
متاعِ گیتی و گردوں فدائے آں کہ من دانم

خدا کی آرزو ئے بندگی سکتے میں آجائے
اگر دیکھے مرے سجدے بہ پائے آں کہ من دانم

شعاعِ چہرۂ گلگون و ابرِ برقعِ شب گوں
مکمل یک فسونِ صبح و مسائے آں کہ من دانم

اگر تو مجھ کو مل سکتا کسی شیریں دھندلکے میں
تجھے میں داد دیتا اے خدائے آں کہ من دانم

تصورِ اہرمن کا اُڑ گیا دل سے دھواں بنکر
بہ تابِ جلوۂ یزداں نمائے آں کہ من دانم

غرورِ سروِ بستانی و نازِ شاخِ مرجانی،
نثارِ پیکرِ زریں قبائے آں کہ من دانم

نہیں موجود ہے واللہ کوئی پیکرِ خوبی
بہ زیرِ گنبدِ گرداں سوائے آں کہ من دانم

طلوعِ صبح کی زرکاریاں قربان ہوتی ہیں
زہے گلتابیِ نکہت سرائے آں کہ من دانم

مری ہر سانس چٹکاتی ہے کلیاں رازِ ہستی کی
بہ فیضِ گیسوئے عقدہ کشائے آں کہ من دانم

بہارستانِ صوتِ سرمدی میں صبح ہوتی ہے
بہ لحنِ بلبلِ شیریں نوائے آں کہ من دانم

نظامِ ثابت و سیار ہم آہنگ ہوتا ہے
ز آوازِ لطیفِ دل ربائے آں کہ من دانم

جسے اہلِ نظر جوشِ ملیح آباد کہتے ہیں
وہ سلطانِ معانی ہے گدائے آں کہ من دانم

جوش ملیح آبادی

میری رہگزر میں

کتنی نظروں کا تکلم، کتنی آنکھوں کا پیام
جنبشِ ابرو کے کتنے دلکش و نازک سلام

کتنے گل افشاں تبسم، کتنے ہونٹوں کا فسوں
چوڑیوں کے زمزموں میں کتنی باہوں کا سکوں

کتنی زلفوں کی مہک، کتنی جبینوں کی دمک!
کتنے پائل کی چھماچھم، کتنے جاموں کی کھنک

کتنے ٹھنڈے دامنوں کی مہکی مہکی سی ہوا،
کتنے رنگیں آنچلوں کی دھنکی دھنکی سی گھٹا،

جلوہ پیرائی سے کتنی جگمگاتی — کھڑکیاں
چلمنوں کے پیچھے کتنی ہی مچلتی — بجلیاں

کتنے سیمیں پیکروں، زریں رخوں کا اعتنا
کتنے مہر و ماہ سے نکھرے ہوئے صبح و مسا

میرے رستے میں بنا دیتے ہیں ہر ذرے کو طور
یعنی منزل کو لئے جاتے ہیں مجھ سے کتنی دور!

سلیمان اریب

کلام شہید بدایونی

وہ کسی کے ہیں میں کسی کا ہوں مگر ایک ربط ہے آجتک
وہی احتیاطِ نگاہ ہے وہی احتیاط کلام ہے

دل کی بربادی بھی کتنی کیف آگیں تھی شہید
اُس نے جب نظریں جھکا لیں میں اُسے دیکھا کیا

اتنا ضرور ہے کہ سکوں تو نہ مل سکا
لیکن ترے بغیر بھی راتیں گزر گئیں

وہ سنبھلے ہوئے تھے مگر تھے فسردہ
نہ آیا انھیں مجھ سے دامن بچانا

احساس تو ضرور تھا لیکن بہار میں
ہم احتیاطِ جیب و گریباں نہ کر سکے

کس نے لکھا ہے یہ دیواروں پہ زنداں کی شہید
جان دینا جس نے سیکھا اُس کو جینا آگیا

مجھے نہ ہوگی کوئی شکایت ارادتاً کم نگاہیوں کی
مگر سرِ بزم میری جانب نگاہ اُٹھی تو کیا کریں گے

سُن کے کل محفل میں ذکرِ حُسنِ دوست
ہم بھی کچھ آنسو بہا کر رہ گئے

جلتے تو تھے چراغ مگر روشنی نہ تھی
تم آگئے تو رونقِ کاشانہ ہو گئی

جن کی بے باکی کے چرچے ہو رہے ہیں بزم میں
میں نے دیکھی ہے ان آنکھوں میں حیا آئی ہوئی

ہنسی آگئی ان کی بیگانگی پر
وہ گزرے برابر سے دامن بچائے

حالات اجازت نہیں دیتے کہ سمجھ لوں
اب زہر مرے غم کی دوا ہے کہ نہیں ہے

ابتک یہ امتیازِ محبت نہ کر سکی
دل بیقرار ہے کہ نظر بے قرار ہے

تم بھی ہو جاؤ گے آزردہ محبت کر کے
یہ بھی افتاد پڑے گی مجھے معلوم نہ تھا

لمحۂ عشرت

فروغِ لالہ و گل سے ہے رونقِ گلشن — مگر ذرا دلِ بلبل سے پوچھ رازِ چمن،
یہ رات اور سہی اے نگارِ سیمیں تن — بہت قریب ہیں آثارِ دستبردِ وطن،
یہ ایک "لمحۂ عشرت" بسا غنیمت ہے — یہ مہکی مہکی فضا، یہ کنارِ رودِ جمن،
یہ رُت، یہ رات مرے ساقیا کوئی پیالہ — فروغِ بادہ سے تاروں کے جام ہیں روشن
زفرش تا بہ لبِ عرش تیرا حکم رواں — پھر آج کیوں ہے یہ پیشانیٔ حسیں پہ شکن
رُکی رُکی سی ہے ماضی کے ولولوں کی سانس — دھواں دھواں سا نظر آ رہا ہے دورِ کہن
دل و جگر پہ سراسیمگی سی طاری ہے — بہت دنوں سے وہ سینے میں ختم ہے دھڑکن
گزر رہا ہوں زمانے کی راہ سے تنہا — نہ کوئی دوست ہے میرا نہ غالباً دشمن
مجھے ہے عشق کی توہین کا خطر ورنہ — کہاں یہ جوشِ جنوں اور کہاں مرا دامن

دہک رہی ہے ہر اک سمت آگ اے اشعر
ہے شعلہ زارِ جہنم مرا غریب وطن

اشعر ملیح آبادی

غزل : (علی سجاد قہر اکبر آبادی - بی - اے)

نہیں ہیں گر مہرباں وہ مجھ پر - تو مجھکو بھی کوئی غم نہیں ہے — کسی کا بارِ کرم اُٹھانا، ستم اُٹھانے سے کم نہیں ہے
جو کیف پنہاں ہے سوزِ غم میں، اُسے کوئی میرے دل سے پوچھے — مصیبتوں سے جو ہیں گریزاں اُنھیں مذاقِ الم نہیں ہے
بجا تری سعیٔ لطف لیکن، تجھے خبر یہ نہیں ہے شاید — کہ تیرا مجھ پر ستم نہ کرنا بھی بھول جانے سے کم نہیں ہے
حریفِ طوفاں جو بن سکے بن کہ زندگی نام ہے اسی کا — سہارا موجوں کا لیکے اُٹھنا بھی ڈوب جانے سے کم نہیں ہے
وہ لاکھ مجھ سے چرائیں نظریں - وہ لاکھ مجھ سے کریں تغافل — نہ دیکھیں مجھ کو یہ انکی کوشش بھی کچھ توجہ سے کم نہیں ہے
خوشا غمِ ہجر و دردِ اُلفت - ہے جس سے وابستہ یاد اُنکی — یہ کیفیت اضطراب کی بھی سکون پانے سے کم نہیں ہے

بھلائیں وہ لاکھ قہر مجھ کو - رہیگا اک ربط پھر بھی باہم
کہ بھول جانے کی سعیٔ پیہم بھی یاد کرنے سے کم نہیں ہے

رفتار وقت آپ کو موسم بہار میں لے آئی ہے

صافی

انسان نے پہلی مرتبہ دنیا میں آنے کے بعد جب اس دنیا کی بے رونقی کو دیکھا تو اس نے کہا "اے مالک تو نے مجھے کیسی دنیا میں بھیجا جہاں نہ مستی ہے نہ شوخی اور نہ زندگی!" مالک نے پوچھا "کیا چاہتا ہے؟" انسان بولا "میں ایسی دنیا چاہتا ہوں جہاں حسن ہو، جوانی ہو، فضائیں مستی ہو، کیف وسرور جو تیری جنت میں ہے۔" مالک نے کہا، "اب تو اس شوخی اور مستی کو برداشت نہیں کر سکے گا۔" انسان نے گڑگڑا کر کہا، "کچھ بھی ہو میرے مالک میری دنیا کو جنت جیسا بنا دے۔"

مالک نے ایک اشارہ کیا، کائنات کا رنگ بدلنے لگا، مست فضائیں چلنے لگیں، زمین سو رنگ کے پھول امنڈ پڑے، پانی شفاف ہو گیا، ہر طرف حسن تھا۔ یہ تھا دنیا کا انقلاب۔

اسی انقلاب کا نام ہے موسم بہار

موسم بہار کے آتے ہی انسان بھی ایک انقلاب محسوس کرنے لگتا ہے قلب امنگوں سے لبریز ہو جاتا، اور خون رگوں میں جوش کھانے لگتا ہے۔ وہ مواد اور بیماریاں جو سردی سے دبی پڑی تھیں بہار کی لطیف گرمی اُن کو ابھیرتی ہے اور وہ پھوڑے پھنسیوں، خارش، کن پھیڑ، خسرہ، چیچک وغیرہ کی شکل میں نمودار ہوتی ہیں۔ ان سب بیماریوں سے بچنے کے لیے قدیم زمانے میں لوگ جلاب لیا کرتے تھے۔ لیکن اس زمانے میں بطور احتیاط سب بڑے چھوٹے صافی کی ایک خوراک روز پیتے ہیں۔ صافی خون کو بڑی احتیاط سے صاف کرتی ہے آپ کو بھی آج ہی صافی پینی شروع کر دینی چاہیے۔ ورنہ آپ موسم کی شوخی اور مستی کو برداشت نہیں کر سکیں گے۔" قیمت — (دس دن کی شیشی) ایک روپیہ۔

ہمدرد مرہم

جلد کی تکلیفوں اور زخموں کے لیے سب سے بہتر مرہم

ہمدرد دواخانہ، دہلی

آزمایش شرط ہے

یہ نیا مرہم تمام جلدی امراض اور زخموں کا

تیر بہدف اور عجیب و غریب علاج ہے۔

ہمدرد مرہم ایک صدی پرانے نسخے سے تیار کیا گیا ہے جسے مغلیہ دور کے اطباء نے ایجاد کیا تھا۔ ہمدرد جس پھرتی سے درد کو روکتا اور سوزش اور ورم کو کم کرتا ہے اسے دیکھ کر آپ دنگ رہ جائیں گے۔ کسی بھی جلدی تکلیف یا زخم پر لگاتے ہی اس کے جراثیم کش اجزا جراثیم کو فوراً ہلاک کر دیتے ہیں۔ یہ زخم کو پکنے اور خون کو زہر آلود ہونے سے بھی بچاتا ہے۔

آپ کو ہمدرد مرہم ضرور آزمانا چاہئے۔ وقت بیوقت کے لئے ایک ڈبیا اپنے مکان، دفتر یا کارخانے میں ضرور رکھئے۔ ایک صدی سے زیادہ عرصے سے جڑی بوٹی سے تیار شدہ یہ مرہم کروڑوں انسانوں کی تکلیف کو رفع کر چکا ہے۔ اب یہ ہندوستانی حکیموں کا خفیہ نسخہ آپ کو تکالیف سے نجات دلانے کیلئے مرہم کی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

ہمدرد کٹنے کے زخم۔ جلنے کے زخم۔ ناسور۔ خارش۔ کھجلی اور داد وغیرہ کے لئے اکسیر ہے۔

آپ کیا جانیں کہ کب آپ کو اس کی ضرورت پڑ جائے
جب کوئی ... ہو جاتا ہے تو اس کا فوراً علاج نہ کرنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ دو ڈبے
خریدیئے ایک گھر کے لئے اور دوسری دفتر یا کارخانے کے لئے۔

ہمدرد مرہم

جڑی بوٹیوں کا

ہمدرد دواخانہ لیبوریٹریز دہلی

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنہ علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:

۱ — چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲ — مادئین کا مذہب

۳ — حرکت کے کرشمے

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حُسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوشخط سرورق رنگین

قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری جسکے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیک نامی پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے، ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت ڈیڑھ روپیہ

نقاب اُٹھ جانیکے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت و علماء کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور انکا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کے لئے کس درجہ سم قاتل ہے، زبان پلاٹ انشا کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

انتقادیات (دو حصے)

حضرت نیاز فتحپوری کے انتقادی مقالات جو دو حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں پہلے حصہ میں وہ مقالات ہیں جن میں خاص خاص شعراء کے کلام پر تنقید کی گئی ہے، مثلاً:- مومن، ظفر، غالب، مصحفی، نظیر، سیماب، جوش، اصغر وغیرہ وغیرہ، دوسرے حصہ میں تمام ادبی و انتقادی مباحث ہیں جنکا تعلق شعر و ادب کی تاریخ سے ہے۔

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور یہ دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔

اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنے رکھتی ہے

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

"نگار" کے خاص نمبر

جنوری سنہ ۳۹ء
(مصحفی نمبر)

اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:
حیات مصحفی۔ اردو غزلگوئی
میں مصحفی کا مرتبہ۔
مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں
انتخاب کلام مطبوعہ وغیر مطبوعہ

قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۰ء
(نظیر نمبر)

اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:
نظیر کا مسلک
شاعری پر تبصرہ
نظیر اور عوام
انتخاب کلام مطبوعہ وغیر مطبوعہ

قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۱ء

یہ نمبر دنیائے تذکرہ میں بالکل پہلی چیز ہے۔ یعنی اسوقت کے تمام مشہور غزل گو شعراء نے خود اپنے حالات لکھے ہیں اور خود اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے۔

قیمت تین روپیہ
علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۲ء

اس نمبر میں ملک کے پانچ مشہور نقادوں نے اُن شاعروں کے کلام پر تبصرہ کیا ہے جن کی غزلوں کا انتخاب جنوری سنہ ۴۱ء میں شایع ہوا تھا

قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔

قیمت ایک روپیہ
علاوہ محصول

نرخنامہ اجرائے اشتہار

	ایک سال	چھ ماہ	تین ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	۶۰۰ روپیہ	۳۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۵۰ روپیہ
نصف صفحہ	۳۲۰ روپیہ	۱۸۰ روپیہ	۹۰ روپیہ	۳۰ روپیہ
چوتھائی صفحہ	۲۰۰ روپیہ	۹۰ روپیہ	۴۵ روپیہ	۱۵ روپیہ

جنوری سنہ ۴۴ء
(جدید شاعری نمبر)

اس میں بتایا گیا ہے کہ جدید رجحانات شعری کی کیا حقیقت ہے اور آزاد نظم نگاری کا وزن و قافیہ سے بے نیاز ہوجانا کیا معنی رکھتا ہے

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۵ء
(قرآن نمبر)

اس میں ڈاکٹر ٹسڈل کے اُن اعتراضات کو پیش کیا گیا ہے جو ماخذ القرآن کے عنوان سے کئے گئے ہیں حضرت نیاز کے فٹ نوٹ اور استدراک کے ساتھ

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندستان کے اندر پانچ روپیہ
ششماہی جاری نہیں ہوسکتا
سالانہ بیرون ہند دس روپیہ

(نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ تک شایع ہوتا ہے اور ۱۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہوسکتا ہے ورنہ پھر کسی طرح نہیں ہوسکتا۔ "منیجر"

کمیشن وغیرہ کی مزید تفصیلات اور قواعد طلب کیجئے۔ منیجر

جواب کے لئے ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے اور خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے